رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

نگار

قیمت
۸ر

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

تصانیف نیاز فتحپوری

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عہ)
علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲۔ افسانے ۱۹۳۳ء تک کے درج ہیں۔ زبان قدرت بیان اعلیٰ تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے

قیمت چار روپیہ (للعہ)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو شایع نہیں ہوئے جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں معہ تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ)
علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشا رعالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)
علاوہ محصول

اُردو شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار جس میں اُردو شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعرا پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے معہ انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت عہ علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہو اس میں تمام مشہور ہندو شعراء کے کلام کا انتخاب معہ ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اُردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

"نگار" جنوری ۱۹۳۷ء

(۱) "ڈرامہ اصحاب کہف"۔ یہ ڈرامہ مصری انشا پرداز توفیق الحکیم کی کتاب "اہل الکہف" سے ماخوذ و مقتبس ہے اور تنہا یہی ایسی چیز ہے جو آپ کے ذوق انشا و تمثیل کو آسودہ کرنے والی ہے۔ اس کے علاوہ (۲) اسکر وائلڈ کے خطوط جو اُسنے سارہ (مشہور ایکٹریس) کو لکھے تھے اور جو دنیائے ادب و انشا میں خاص مرتبہ کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ وائلڈ اپنے طرز انشا و ندرت بیان کے لحاظ سے یوروپ میں جس مرتبہ کا شخص شمار ہوتا تھا اسکا اندازہ آپ ان خطوط سے کر سکتے ہیں (۳) "مسئلۂ خلافت و امامت" (آزاد خیال شیعی کے قلم سے) مسئلہ خلافت و امامت لاکھ قدیم و لاینحل سہی پھر بھی اس سلسلہ تحقیق و جستجو میں بعض ایسی باتوں کے نکلنے کا امکان ہے جن سے مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو سکے چنانچہ اس سلسلہ کا یہ پانچواں مقالہ ہے اسکے بعض عنوان یہ ہیں:۔ مسئلہ خلافت کے مبادی مقدمات۔ نفس مسئلہ خلافت۔ مسئلہ خلافت کے فروع و جزئیات وغیرہ ——— صفحات ۱۴۴ — قیمت عہ علاوہ محصول

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

معاون:- جلیل اعظمی

جلد ۳۳ | فہرست مضامین فروری سنہ ۱۹۳۸ء | شمار ۲

ملاحظات ---------------------------------- ۲ —— ۸
قدرت کے عجائب و غرائب ---------------------------------- ۹ —— ۱۴
اُردو غزل میں اخلاقیات ---------- فراق گورکھپوری ---------- ۱۵ —— ۲۲
فلسفہ کیا ہے؟ ---------- مرزا محبوب بیگ ---------- ۲۳ —— ۳۰
حب وطن ---------- تقی علی یاسمی ---------- ۳۱ —— ۳۴
حالی کا مرتبہ اُردو ادب میں ---------- مجنوں گورکھپوری ---------- ۳۵ —— ۴۲
مکتوبات نیاز ---------------------------------- ۴۳ —— ۴۷
سیاسیات یوروپ ---------------------------------- ۴۸ —— ۵۹
باب الاستفسار ---------------------------------- ۶۰ —— ۶۲
منظومات ---------- کیفی چریاکوٹی - ہوش بلگرامی ---------- ۶۳ —— ۶۴
اسلامی ہند ---------------------------------- ۱ —— ۱۲۸
نغمۂ کارواں ---------------------------------- ۹ —— ۱۲

اصلی برقی قوام (تمباکوئے خوردنی قیمتی فی تولہ ۴/) صرف شیخ خورشید علی پرفیومر نظیر آباد لکھنؤ کے پتہ سے مل سکتا ہے

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

معاون:۔ جلیل اعظمی

جلد ۳۲	فروری سنہ ۳۸ء	شمار ۲

ملاحظات

شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں

پچھلے مہینے کے نگار میں، اشارتاً میں نے ظاہر کیا تھا کہ کانگرس باوصف اُن تمام عقاید و مقاصد کے جن پر انسانیت ناز کر سکتی ہے، اپنے دائرۂ عمل میں ایسے افراد بھی رکھتی ہے، جو عملاً کانگرس کے نصب العین کی توہین کرنے والے ہیں اور جو ہندو مسلم اتحاد کو پسند نہیں کرتے ـــ یہ میں کہتا ہوں ورنہ اکثر کا خیال تو یہی ہے کہ خود کانگرس اس اتفاق پر زیادہ زور نہیں دینا چاہتی، کیونکہ اس کا مقصود یہی ہے کہ وہ یہاں ہندو راج قائم کر کے مسلمانوں کو بدستور مغلوب و پست حالت میں رہنے پر مجبور کرے۔

آج میں ذرا تفصیل کے ساتھ غور کرنا چاہتا ہوں کہ کیا مسلمانوں کا یہ اندیشہ غلط ہے اور کیا کانگرس اس الزام کو دور کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس سے قبل متعدد بار مختلف اوقات میں اس مسئلہ کو واضح کر چکا ہوں کہ ہندو مسلم اختلاف کی حقیقی بنیاد

کیا ہے اور ان دونوں جماعتوں میں اگر کبھی اتفاق کی کوئی صورت پیدا ہوئی تو اس کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے — اگر آج ہندو مسلمانوں کے درمیان مذہب کا قدم درمیان نہ ہو، تو یہ گتھی نہایت آسانی سے سلجھ سکتی ہے، کیونکہ اُسوقت نہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوگا کہ مسلمان گائے کا گوشت کھاتا ہے اور ملکش ہے، نہ مسلمان یہ کہے گا کہ ہندو سنکھ بجاتا ہے اور کافر ہے لیکن چونکہ ایسا ہونا ممکن نہیں اسلئے غور طلب امر یہ ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ مذہب کے پابند رہتے ہوئے کیونکر ایک دوسرے سے متحد ہو سکتے ہیں اور شاید یہی وہ چیز ہے جسے کانگرس نے سمجھا لیکن اس پر عمل نہیں کیا اور مسلم لیگ نہ سمجھتی ہے نہ عمل کرنا چاہتی ہے

یہ صحیح ہے کہ ہندویت نام مذہب کا نہیں ہے بلکہ صرف ایک مخصوص نظامِ معاشرت اور دیرینہ سماجی روایات کی بنا پر قایم ہونے والی ایک خاص ذہنیت کا نام ہے، یہاں تک کہ ایک ہندو گائے کا گوشت کھانے اور تمام دیوتاؤں کا انکار کرنے کے بعد بھی ہندویت سے خارج نہیں ہو سکتا، لیکن اس کا کیا علاج کہ ان کی معاشرت کا یہی نظام اور ان کا یہی کلچر بجائے خود اتنی زبردست چیز ہے کہ بغیر احساسِ مذہب و لامذہبیت وہ ایک مستقل مذہب بنکر رہ گیا ہے اور اس کو ایک ہندو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا — پھر چونکہ ہندوؤں کی تہذیب یکسر مقامی اثرات کی پیدا کی ہوئی چیز ہے اور اس کے تار و پود کا ایک تاگا بھی باہر کا نہیں ہے اس لئے ان کی بیداری کا مفہوم سوائے اس کے کچھ نہ ہو سکتا تھا کہ وہ وطنیت پرستی کی طرف مایل ہو جائیں اور جس سرزمین پر ایک وقت غیر معلوم سے ان کی ذہنیتیں متاثر ہو ہو کر ایک مخصوص ذوق پر آکر ٹھہر گئی ہیں، اس کی عزت و محبت کو اپنا شعار مذہب قرار دیں جسے جدید سیاسی اصطلاح میں قومیت و وطنیت کہتے ہیں

اب اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کی افتادِ مزاج کیا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں غالب حصہ ان کا ہے جن کے آبا و اجداد ہندو تھے لیکن عیسویت کی طرح اسلام کی یہ خصوصیت کہ جہاں وہ گیا اپنی تہذیب و معاشرت ساتھ لے گیا، انھے یہاں بھی نو مسلموں کی ذہنیت، اور معاشرت و تہذیب کو متاثر کیا اور جو اس دائرہ سے جسقدر قریب تھا اس پر اتنا ہی گہرا رنگ چڑھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں کچھ تو اس وجہ سے کہ وہ بہ لحاظ مذہبیت اپنے کو بہت فایق سمجھتے تھے اور کچھ اس سبب سے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو فاتح قوم کا فرد خیال کرتا تھا، یہاں کی آبادی کی طرف سے جذبۂ احتراز پیدا ہونے لگا اور سرزمین ہند کے ساتھ تعلق وطنیت عرصہ تک ان میں پیدا نہ ہو سکا، اور اب بھی بہت کم مسلم افراد ایسے ہیں جن کے دلوں میں وطنی محبت کی وہی آگ روشن ہو جو ہندوؤں کے سینہ میں پائی جاتی ہے

اس میں کلام نہیں کہ مسلمانوں کا یہ طرزِ عمل سخت غیر پسندیدہ تھا اور ملک کو اس سے کافی نقصان پہونچا لیکن سوال یہ ہے کہ اسلامی حکومت ختم ہو جانے کے بعد جب ہندو مسلم دونوں یکساں غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے تو خود ہندوؤں نے مسلمانوں کو اپنی طرف مایل کرنے کی کیا کوشش کی اور اب کہ کانگرس برسرِ اقتدار ہے اہلِ کانگرس نے کیا کیا

جسوقت ہم ہندوؤں میں مہا سبھائی جماعت کو پیش نظر رکھتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کو نہ صرف یہ کہ غیر ضروری سمجھا بلکہ اس کی مخالفت کر کے بہ الفاظ دیگر گویا صاف صاف اعلان کر دیا کہ وہ یہاں خالص ہندو حکومت

چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو اپنا شریک بنانا پسند نہیں کرتے، چنانچہ اس جماعت کا نصب العین اب صرف یہ ہے کہ ہر ممکن عصبیت سے کام لیکر مسلمانوں کو پامال کیا جائے، ان کی تہذیب و معاشرت کو مٹا دیا جائے، ان کو اُبھرنے کا کوئی موقعہ نہ دیا جائے، اور ہندوستان کی مقدس سرزمین کو ان کے ناپاک وجود سے پاک کر دیا جائے

بیشک کانگرس مہا سبھائی جماعت نہیں ہے اور اصولاً وہاں وہی سب کچھ نظر آتا ہے جو ایک آزاد خیال ڈیماکریٹک حکومت کے پروگرام میں پایا جانا چاہئے، لیکن جسوقت عملاً ہمیں اس سے واسطہ پڑتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مہا سبھائی ذہنیت در پردہ وہاں بھی کام کر رہی ہے اور کانگرس کے تمام وہ لیڈر جو قدر اول کی حیثیت رکھتے ہیں اول تو پوری طرح اس سے واقف نہیں ہیں اور اگر کبھی ان کے کانوں تک یہ بات پہونچ جاتی ہے تو اسے غیر اہم سمجھ کر ٹال جاتے ہیں

اس وقت کانگرس میں دو جماعتیں شامل ہیں ایک سوشلسٹ جس کے قاید و رہنما پنڈت جواہر لال نہرو ہیں اور دوسری وہ نرم جماعت جو آجکل برسر اقتدار ہے۔ ان دونوں کے نصب العین اور طریق کار میں بہت فرق ہے لیکن فی الحال ان دونوں نے مہاتما گاندھی کو نقطۂ اشتراک بنا کر آپس میں سمجھوتا کر لیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک گاندھی جی زندہ ہیں سوشلسٹ جماعت جس سے بہت زیادہ آزاد خیالی کی توقع ہے، اپنے نصب العین کو بروئے کار نہیں لا سکتی

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی تقریروں میں بارہا ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے ہوئے اختلافی مسایل سے بھی بحث کی ہے اور وہ یقیناً ان دونوں جماعتوں کا اشتراک عمل بھی چاہتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے بعض نہایت اہم معاملات کو غیر اہم قرار دیکر ان سے سرسری گزر جانا چاہا اور اس طرح جو پھانس مسلمانوں کے دلوں میں کھٹک رہی تھی بدستور قایم رہی

میں اس سلسلہ میں سب سے پہلے زبان کے مسئلہ کو لیتا ہوں۔ پنڈت جی نے اپنے خطبات میں اختلافِ زبان و رسمِ خط کا ذکر کرکے باہمی صلح و مفاہمت کی صورتیں پیدا کرنے کی پوری کوشش کی ہے، لیکن عملاً انھوں نے اسوقت تک کچھ نہیں کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں جماعتوں کا اختلاف برابر بڑھتا جا رہا ہے اور رفتہ رفتہ صورتِ حال ایسی پیدا ہو گئی ہے کہ خود کانگرس بھی کوئی تاویل ایسی نہیں کر سکتی جس سے مسلمانوں کو اطمینان پیدا ہو سکے

اس صوبہ میں کوئی تعلیم یافتہ ہندو ایسا نہیں جو، نہایت صاف و شگفتہ اُردو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو لیکن جسوقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کانگرس کے تمام ذمہ دار افراد یہاں تک کہ وزارت کے بھی جملہ ہندو ارکان اُردو زبان اور اُردو رسمِ خط کو ترک کرتے جا رہے ہیں تو مسلمانوں کو یہ سمجھنے کا حق حاصل ہوتا ہے کہ ہندو اُن سے ملنا پسند ہی نہیں کرتے اور اس کا یقین بھی دلانا چاہتے ہیں

کسقدر حیرتناک امر ہے کہ یوپی کے ارکانِ وزارت و اسمبلی جب اظہار خیال کرتے ہیں تو اس کی زبان باوجود ہندی و سنسکرت کی آمیزش کے صاف اُردو ہی ہوتی ہے، لیکن جسوقت دفتر اُن سے پوچھتا ہے کہ اس کو کس رسمِ خط میں شایع کیا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ "دیوناگری میں"

یہاں لکھنؤ کی سودیشی نمایش کے دفتر کا سائن بورڈ طیار ہوتا ہے، تو صرف انگریزی، ہندی میں، اور جسوقت پوچھا جاتا ہے کہ اُردو کیوں نہیں ہے تو صاف جواب ملتا ہے کہ "اس کی کیا ضرورت ہے"۔ انگریزی ان کے لئے ضروری تھی، درانحالیکہ کوئی یوروپین انکی نمایش میں شرکت کے لئے آمادہ نہ تھا اور اُردو غیر ضروری تھی حالانکہ لکھنؤ کی تقریباً ایک لاکھ مسلم آبادی سے شرکت کی توقع کی جاتی تھی

پنجاب کا ایک ہندو اشتہار طلب کرنے دفتر میں آتا ہے تو پہلے اس کا نام پوچھا جاتا ہے اور پھر اس کو ہندی کا اشتہار دیا جاتا ہے، وہ کہتا ہے کہ "میں پنجاب کا باشندہ ہوں اور ہندی رسم خط سے واقف نہیں" یہ سنکر انتہائی برہمی کے ساتھ جواب دیا جاتا ہے کہ "تم ہندو ہو، تم کو ہندی سیکھنا پڑے گی اور ہندی اشتہار ہی تمھیں دیا جائے گا"

یہ حال ہے یو۔پی کے ہندوؤں کی ذہنیت کا جو اپنے گھروں میں ہر وقت صاف و شگفتہ اُردو بولتے ہیں اور اسی کے ساتھ یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے طیار ہیں

حال ہی میں پنڈت جواہر لال نہرو کی سفارش پر کانگرس نے Muslim Mass Contact یعنی عام مسلمانوں کو شرکت کانگرس کی طرف مایل کرنے کی تجویز پاس کی اور صوبہ کی تمام کانگرسی کمیٹیوں کو اسکی اطلاع دی گئی، لیکن غالباً بہت کم اس پر عمل کیا گیا۔ خود یہیں لکھنؤ میں کانگرس کمیٹی کے ارکان کو بعض کانگرسی مسلمانوں نے بار بار توجہ دلائی، لیکن انھوں نے کوئی عملی قدم اس طرف نہیں اُٹھایا اور ہمیشہ یہی عذر لنگ پیش کیا کہ ممکن ہے انکے اقدام سے فساد پیدا ہو جائے

خود یو۔پی کی وزارت نے مسلمانوں کے حقوق کا کس حد تک لحاظ کیا، اسکے متعلق صحیح اعداد و شمار تو اسوقت پیش نہیں کر سکتا، لیکن یہ یقینی طور پر معلوم ہے کہ دیہات سدھار کے کام میں نسبت آبادی سے بہت کم جگہیں مسلمانوں کو دی گئی ہیں اور اسی طرح تکمیل تعلیم کے لئے جو وظایف دئے گئے ہیں ان میں بھی مسلمانوں کا حصہ بہت کم ہے

ان تمام باتوں کے مطالعہ سے ایک بات بالکل واضح ہو جاتی ہے، وہ یہ کہ تقریباً تمام ٹاؤن کانگرس کمیٹیوں پر مہاسبھائی ذہنیت کے لوگ چھائے ہوئے ہیں اور کانگرس کے حقیقی مقصود کو ان سے سخت نقصان پہونچ رہا ہے

پنڈت جواہر لال نہرو کے نزدیک زبان اور رسم خط کا مسئلہ زیادہ اہم نہیں ہے اور انھوں نے ہمیشہ اس مسئلہ کو معمولی کہکر ٹالنا چاہا ہے، اسی طرح ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ عام طور پر کانگرس کمیٹیاں مسلمانوں کے جذبات کی رعایت نہ کرکے کس طرح ان سے دور ہوتی جا رہی ہیں، لیکن انھوں نے کبھی کسی کمیٹی سے باز پرس نہیں کی۔ پھر ہو سکتا ہے کہ پنڈت جی کو اپنے عزائم اور اشتراکی آزادہ روی کے مقابلہ میں یہ باتیں بہت معمولی نظر آئیں، لیکن انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ عمارت کا ذرا سا شگاف ہی کبھی پوری تعمیر کے ڈھا جانے کا باعث ہو جاتا ہے اور کشتی کا چھوٹا سا سوراخ ہی اکثر اسے ڈبو کر رکھ دیتا ہے۔ بیشک ہندو مسلم اتحاد کا خیال نہایت مبارک خیال ہے اور کانگرس کا یہ اعلان کہ وہ اقلیتوں کے مطالبات و جذبات کی رواداری کے لئے ہمیشہ آمادہ ہے نہایت دلخوش کن اعلان ہے۔ لیکن جسوقت ہم خیال و قیاس کی دنیا سے ہٹ کر کردار و عمل کا جایزہ لیتے ہیں تو ہم نہایت مایوسی کے ساتھ

اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ نہ باہمی اتحاد کے لئے کانگرس کی طرف سے کوئی کوشش کی جارہی ہے اور نہ مسلمانوں کے جذبات کی انھیں حقیقتاً پرواہ ہے

دنیا میں اتحاد و اتفاق کا فلسفہ ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور وہ یہ کہ فریقین ایک دوسرے کے ذوق کا خیال کر کے ایثار سے کام لیں اور اگر کوئی فریق غالب ہے تو وہ اس کا اور زیادہ لحاظ رکھے۔ پھر اگر کانگرس واقعی ہندو مسلمان دونوں کو ایک متحدہ پلیٹ فارم پر دیکھنا چاہتی ہے تو اسے چاہئے کہ ہندوؤں کو بے لگام نہ ہونے دے اور اس کے نظام میں جہاں کوئی شخص جہا بھائی ذہنیت کا نظر آئے اُسے فوراً علحدہ کر دے۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ وہ اس ادائے فرض کی طرف سے بالکل غافل ہے اور اسلئے اس کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ مسلمانوں کو شرکت کانگرس کی دعوت دے اور جب ان کی طرف سے کوئی عذر پیش کیا جائے تو اسے غداری، وطن فروشی اور رجعت پسندی وغیرہ سے تعبیر کیا جائے

زبان اور رسم خط کے باب میں ہندوؤں کی طرف سے ہمیشہ یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اگر انھوں نے اُردو زبان یا اُردو رسم خط کو چھوڑ کر دیوناگری کو اختیار کر لیا ہے تو مسلمانوں کا اس میں کیا نقصان ہے اور انھیں کیوں ناگوار ہوتا ہے لیکن انکی یہ دلیل بالکل بے بنیاد ہے۔ کچھ زمانہ قبل کی بات ہے کہ ہندو (خصوصیت کے ساتھ شمالی ہند کے ہندو) اُردو زبان ہی بولتے اور لکھتے تھے، اس لئے اُصولاً یہ سوال انھیں سے کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے کیوں اس کو ترک کر کے دوسرا رسم خط اختیار کیا اور کیا ان کا یہ طرزِ عمل اس بات کو ظاہر نہیں کرتا کہ وہ اپنی دنیا مسلمانوں سے بالکل علحدہ ہو کر بسانا چاہتے ہیں اور کیا اس صورت میں انھیں مسلمانوں سے اس شکایت کا کوئی حق باقی رہتا ہے کہ وہ کیوں ان سے الگ تھلگ رہتے ہیں

اسوقت مسلمان کا کوئی متعین کلچر ہو یا نہ ہو، اس کی اجتماعی حیثیت مرکزیت رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو، اس میں قومیت کا صحیح مفہوم پایا جاتا ہو یا نہ پایا جاتا ہو، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ وہ اپنے اندر بعض ایسی خصوصیات ضرور رکھتا ہے جسکی بناء پر اسے ہندو نہیں کہہ سکتے اور اگر اس کا تعلق صرف ذوق و وجدان سے ہو تو بھی کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ اس سے اس کے محو کر دینے کا تقاضہ کرے

اگر کوئی ہم سے اعتماد کا مطالبہ کرے تو قدرتاً ہم یہ غور کرنے پر مجبور ہوں گے کہ وہ ہمارے لئے کیا ایثار کرتا یا کر سکتا ہے۔ بنا براں اگر ہم کانگرس کی کارروائیوں اور اہل کانگرس کے طرز عمل پر بھی اسی نقطۂ نظر سے غور کریں تو یہ ہمارا غیر فطری حق نہ ہوگا اور اگر ان کی طرف سے کوئی ایثار و رواداری کی مثال ہم کو نظر نہ آئے تو ہمارا پس و پیش کسی طرح موردِ الزام قرار نہ پائے گا

پھر جو مثالیں میں نے پیش کی ہیں کیا وہ جذبۂ اعتماد کو ضعیف کر دینے والی نہیں ہیں اور کیا اس صورت میں مسلمان کبھی اپنی قسمت کا فیصلہ ہندوؤں کے ہاتھ میں دے سکتے ہیں؟

میں نے ہمیشہ کانگرس ہی کو تنہا ذمہ دار سیاسی جماعت سمجھا ہے اور میں اسے کبھی پسند نہیں کرتا کہ جب تک ملک آزاد نہ ہو اس کی سیاسیات ایک سے زائد جماعتوں میں منقسم رہے، لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اگر کانگرس کی ترکیب

یا اس کے نظامِ عمل میں مجھے کوئی نقص نظر آئے تو میں صرف اس لئے خاموش رہوں کہ اس سے بہتر تنظیم کی کوئی صورت میرے پیشِ نظر نہیں ہے

پس اگر کانگرس واقعی مسلمانوں کی شرکت کو ضروری سمجھتی ہے (یہاں یہ سوال نہ اُٹھانا چاہئے کہ مسلمان کیا سمجھتے ہیں) تو اس کا فرض ہونا چاہئے کہ مہا سبھائی ذہنیت رکھنے والے افراد اپنے اندر سے علیحدہ کردے اور جب کبھی ہندؤں کی طرف سے کوئی ایسی بات ظاہر ہو تو اس کا انسداد کرے۔ حیرت ہے کہ بلیا میں کھلم کھلا وہ کچھ ہوتا ہے جو نہ ہونا چاہئے، اور کارکنانِ کانگرس کی موجودگی میں ہوتا ہے، لیکن نہ پنڈت جواہر لال نہرو کوئی صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور نہ کانگرس- میں نے مسلمانوں کو ہمیشہ کانگرس میں شرکت کا مشورہ دیا ہے نہ اس لئے کہ اس وقت مسلمانوں کے سامنے جو دو محاذ قایم ہیں ان میں سے ایک ٹوٹ جائے گا بلکہ اس لئے کہ ان کی شرکت سے کانگرس کے اندر جو مہا سبھائی ذہنیت پائی جاتی ہے وہ ضعیف ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ بعض ٹاؤن کانگرس کمیٹیوں پر ان کا قبضہ ہو جائے

مُسلم لیگ اس میں شک نہیں کہ کانگرس میں مہا سبھائی ذہنیت پیدا ہو جانے کی وجہ سے اب اس کا امکان بہت کم ہے کہ مسلمان کثرت کے ساتھ اس میں شریک ہوں گے اور آزادی کی جنگ میں کوئی متحدہ محاذ قایم ہو سکے گا۔ لیکن کانگرس کی خرابی "مسلم لیگ" کی خوبی کو مستلزم نہیں ہے

جس حد تک مقاصد کا تعلق ہے، مسلم لیگ کا وجود مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سنوارنے کے لئے یقیناً بہت مفید معلوم ہوتا ہے، لیکن مقاصد کی تعیین کوئی چیز نہیں جب تک عملاً ان کی تکمیل کے لئے قدم نہ اُٹھایا جائے، اور یہی وہ چیز ہے جس کی توقع اربابِ مسلم لیگ سے رکھنا عبث ہے

مسلمانوں کی آج تک جتنی انجمنیں قایم ہوئیں، ان سب کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت میں مذہب سے رہا ہے اور وہ بھی ہندوستان سے باہر عرب و حجاز، مصر و ترکی کی حمایت میں۔ پھر یہ تو ہوا کہ انھوں نے لاکھوں روپیہ خلافت اور خدمتِ کعبہ کے نام سے جمع کرکے کچھ وہاں بھیجدیا اور کچھ یہاں خرچ کر ڈالا، لیکن خود اپنی اقتصادی، سیاسی یا اجتماعی تنظیم کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔۔۔ حال ہی میں مسٹر جناح نے جو خطبۂ صدارت لکھنؤ میں پڑھا وہ جس حد تک الفاظ کا تعلق تھا، یقیناً بہت کامیاب رہا، لیکن معنی کے لحاظ سے وہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کو کسی ایک رشتہ سے وابستہ ہو کر اتفاق و اتحاد کے ساتھ آگے قدم بڑھانا چاہئے، لیکن کسی چیز کی تمنا کرنا اس کا حاصل ہو جانا نہیں ہے۔ پھر آپ اسوقت تک مسلم لیگ کے تمام لٹریچر کا مطالعہ کیجئے تو سوائے بلند بانگ دعووں کے کام کی ایک بات بھی اس میں نظر نہ آئے گی۔ اس میں اللہ اکبر کے نعرے بھی ہیں اور گزشتہ عظمتِ اسلام کی داستانیں بھی۔ تیغوں کے سایہ میں پل کر اپنے جوان ہونے کا بھی اس میں ذکر ہے اور خالدِ جانباز کے کارناموں کا بھی اظہار، لیکن یہ کسی جگہ نہیں بتایا گیا کہ مسلمان کے

زندہ رہنے کی کیا صورت ہے

اس وقت مسلم لیگ کا طرۂ امتیاز یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے آزادی کامل کا رزولیوشن پاس کر کے ایسا بلند نصب العین پیش کیا ہے کہ کانگرس کو بھی اس کے سامنے سرنگوں ہو جانا چاہئے۔ پھر کیا اس قسم کی تجویزیں پیش کرنا کوئی نئی بات ہے اور کیا اس سے قبل مسلمانوں نے متعدد بار اس کا اظہار نہیں کیا کہ وہ غیر مشروط آزادی سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہو سکتے، لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا، وہی غیر مشروط غلامی!

ہم نے مانا کہ اسوقت مسلم لیگ کی شاخیں ہندوستان کے ہر ہر گوشے میں قایم ہو رہی ہیں اور مسلمان جوق در جوق اُس میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن جب تک کوئی عملی کام شروع نہ کیا جائے (جسکی کوئی توقع نہیں) یہ سب تضیع اوقات سے زیادہ نہیں

اگر مسلم لیگ تمام مذہبی، سیاسی و معاشرتی مقاصد کو چھوڑ کر صرف اقتصادی نظام کو سامنے رکھے اور صدقہ و زکوٰۃ کا ایک مرکزی فنڈ قایم کر کے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی خیرات و زکوٰۃ کا نظم و اہتمام اپنے ہاتھ میں لیلے تو پھر اسے کسی اور اصلاح کی ضرورت باقی نہیں رہتی

مسلمانوں کی آٹھ نو کرور آبادی میں صاحب استطاعت حضرات اتنے ضرور ہیں کہ اگر وہ واجب صدقہ و زکوٰۃ ادا کریں تو فی کس آٹھ آنے سالانہ کا اوسط یقیناً پڑ سکتا ہے، جس کے معنے یہ ہیں کہ چار کرور روپیہ ہر سال بہ آسانی جمع ہو سکتا ہے اور یہ اتنی بڑی رقم ہے کہ اگر اصول و قاعدہ کے ساتھ اس کو صرف کیا جائے تو ایک ربع صدی کے اندر قوم کی قوم تعلیمی و اقتصادی حیثیت سے خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچ سکتی ہے۔ لیکن کام کرنا تو ارباب مسلم لیگ کا مقصود ہی نہیں ہے۔ وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ کانگرس کے مقابلہ میں تفوق ظاہر کر کے اپنی قیادت و سیادت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، خواہ اس جذبۂ خود پرستی پر قوم کی قوم کیوں نہ قربان کرنی پڑے۔

مسلم لیگ کانگرس میں شریک ہونے سے اس لئے احتراز کرتی ہے کہ اسے ہندوؤں کی اکثریت سے اندیشہ ہے، لیکن یہ اندیشہ اسوقت ہونا چاہئے جب مسلمان اپنی ہستی کانگرس میں جذب کر دینے کے لئے شریک ہوں، لیکن اگر ان کا مقصود اپنے مطالبات پورے کرانا، کانگرس کی مہاسبھائی ذہنیت کو دور کرنا اور ان کی بے راہ روی کی روک ٹوک کرنا ہو تو پھر اندیشہ کی کیا بات ہے

اگر کانگرس یہ کہتی ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے تو اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اگر کل اسکی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہو تو ہم اس سے علٰحدہ نہیں ہو سکتے۔ اگر مسلمانوں نے اپنی جماعت علٰحدہ کر کے سیاسی جد و جہد شروع کی تو ان کو دو فریق سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ انگریز اور ہندو، برخلاف اس کے کانگرس میں شریک ہونے کے بعد صرف ایک فریق مقابل رہجائیگا اور اس کو شکست دینے کے بعد ہم زیادہ آسانی کے ساتھ یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ آیا ہم کانگرس ہی میں شریک رہکر اپنے آپ کو قایم رکھ سکتے ہیں یا اُس سے جدا ہو کر۔

قدرت کے عجائب وغرائب

(زمین اور دُمدار ستاروں کا تصادُم)

انیسویں صدی میں صرف ۲۳۵ دُمدار ستاروں کا انکشاف ہوا تھا لیکن گزشتہ نصف صدی کے دوران میں اوسطاً ہر آٹھ برس کے بعد ایک نیا دمدار ستارہ معلوم ہوتا رہتا ہے۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں ایک دُمدار ستارہ اتنا روشن نکلا تھا کہ دن میں بآسانی نظر آتا تھا اور اُس کی دُم دس کروڑ میل لمبی تھی، اس سے زیادہ چمکیلا دمدار ستارہ ابھی تک نظر نہیں آیا۔ سنہ ۱۸۱۱ء اور سنہ ۱۸۸۳ء کے مابین چھ روشن دمدار ستارے نظر آئے، ان میں سب سے بڑا ستارہ سنہ ۱۸۴۳ء میں دکھائی پڑا تھا جس کی دُم دو ارب میل تک آسمان پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس ستارہ کی آمد کا پہلے کسی کو خیال بھی نہ تھا اور یہ یکایک نظروں کے سامنے آگیا مگر واقعہ یہ ہے کہ اکثر دمدار ستارے اسی طرح یکایک نظروں کے سامنے آجاتے ہیں

سنہ ۱۶۱۰ء میں گلیلو کی دوربین کی ایجاد سے قبل ۴۰۰ دمدار ستاروں کے بارہ میں دنیا کو واقفیت تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُسوقت تک وہی ستارے دریافت ہوئے جو اپنی روشنی کی وجہ سے انسان کو خود بخود اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس قسم کے ستارے ایک صدی میں ۳۰ کے حساب سے دکھائی پڑتے تھے

دوربین کی ایجاد کے بعد سے ۴۷۰ دمدار ستارے دریافت ہوئے ہیں، تقریباً ۷۰ اٹھارویں صدی میں اور ۲۳۵ اُنیسویں صدی میں۔ گزشتہ ۴۰ برس میں تقریباً ۲۰۵ دمدار ستارے دریافت ہو چکے ہیں۔ سنہ ۱۸۸۸ء اور سنہ ۱۹۰۹ء کے مابین (ہر سال اوسطاً پانچ کے حساب سے) ۱۰۵ دمدار ستاروں کا انکشاف ہوا ہے۔ لیکن جنگ عظیم کے بعد سے دمدار ستارے بہت کم دریافت ہوئے ہیں اور اس کی وجہ ڈاکٹر رسل آف نیوجرسی نے یہ بتائی ہے کہ جنگ عظیم کے بعد سے لوگوں نے ان ستاروں کی تحقیق میں کمی کر دی ہے۔ دمدار ستارے جوں جوں سورج کے قریب آتے جاتے ہیں ان کی تیزی بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ انکی رفتار رائفل کی گولی سے ۵۰ گنی زیادہ ہو جاتی ہے

ان ستاروں کی چمک کے متعلق کوئی شخص یقینی طور سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ تیز ہوگی یا نہیں کیونکہ یہ چمک صرف اس کی روشنی ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ چند دوسری چیزوں سے بھی وابستہ ہے۔ مثلاً خاص طور سے وہ کیمیائی عناصر جن سے

ستارہ کا سر، جسم اور دُم بنتی ہے۔ علاوہ بریں ستارہ اور دیکھنے والے کے مقام کے تناسب سے بھی روشنی میں فرق ہوتا رہتا ہے۔ ایک اور وجہ سطح شمسی سے ستارہ کی قربت بھی ہے۔ ۱۸۴۳ء کا ستارہ ایک مرتبہ سورج سے صرف ۵۰ ہزار میل کے قریب چکر لگا رہا۔ آفتاب کے قریب اتنی نزدیکی سے ابھی تک کوئی اور چیز نہیں آئی ہے اور اس ستارہ کی آفتاب کے اندر نہ گرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ اُس میں بے انتہا تیزی تھی یعنی تقریباً دس لاکھ میل فی گھنٹہ

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ دنیا میں اتنی طاقتور دوربینیں موجود ہیں، اکثر روشن دمدار ستارے کیوں اچانک نظر آجاتے ہیں اور ان کی آمد کے متعلق پہلے سے کوئی اطلاع نہیں ہوتی

اس کی تشریح یوں کی جاسکتی ہے کہ اگر شمالی کرۂ ارض میں کوئی ستارہ، آفتاب کے مقام سے کچھ فاصلہ کی طرف سے کسی خاص موسم میں آرہا ہو تو ہیئت داں اُسے آنکھوں سے دیکھنے کے قبل دوربینوں کی مدد سے کئی ماہ پہلے ہی دیکھ سکتے ہیں لیکن یہ نہیں ہوتا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ دمدار ستارے سورج کے قریب ہر طرف سے آتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ سورج کی پشت پر ہو جاتے ہیں اس وجہ سے نہیں دکھائی پڑتے اور یا آفتاب کی تیز کرنوں کی وجہ سے دوربین بھی انھیں دیکھنے سے عاجز رہتی ہے

دنیا میں نہ معلوم کتنے دمدار ستارے ایسے ہیں جو ادھر ادھر آتے جاتے ہیں مگر ان کو کوئی نہیں دیکھتا۔ ایک مشہور ہیئت داں کا خیال ہے کہ ہر صدی میں تقریباً ایک ہزار دُمدار ستارے نظروں کے سامنے آتے ہیں مگر ہم ۵۰۰ سے زیادہ نہیں دیکھ پاتے۔ غالباً ہر وہ ستارہ جس کی دم اور سر کا قطر ۱۵ ہزار میل سے کم ہوتا ہے نہیں دکھائی پڑتا — ۱۹۱۹ء میں غیر معمولی طور سے متعدد نئے ستارے دریافت ہوئے اور کئی "مستقل نظر آنے والے" بھی دکھائی پڑے تھے۔ یہ "مستقل نظر آنے والے" دمدار ستارے تعداد میں تقریباً ۱۰۰ یا اس سے کچھ زیادہ ہیں اور آفتاب کے گرد ایک مقررہ راستہ پر چکر لگایا کرتے ہیں

زمین اور دُمدار ستارہ کا تصادم

کوئی ماہر ریاضی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ دمدار ستارہ اور زمین میں تصادم ممکن ہے، کیونکہ دُمدار ستاروں کی گردش کا راستہ زمین کے خط گردش پر صفر سے ۹۰ ڈگری تک زاویہ بناتا ہے اور بعض ستاروں کا راستہ زمین کے راستہ کو کاٹتا بھی ہے۔ لہذا اگر کوئی ستارہ اور زمین باہم کر متصادم ہو جائیں تو گمان غالب یہ ہے کہ زمین کے باشندوں کو سخت نقصان پہونچے گا مگر ایک مشہور فرانسیسی ریاضی داں بینٹ Babinet (۱۷۹۴ء - ۱۸۷۲ء) کا خیال ہے کہ اس قسم کا تصادم ۱۵۰ لاکھ برس میں ایک دفعہ سے زیادہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا تصادم کب ہوا ہے اگر ۱۵۰ لاکھ برس یا ۲ کرور برس قبل کوئی تصادم ہو چکا ہے تو اب دوسرے تصادم کا وقت قریب آگیا ہے۔ مگر پھر سوال ہوتا ہے کہ آیا کوئی تصادم اس وقت تک ہوا بھی ہے یا نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ گو بعض دمدار ستارے زمین سے کہیں زیادہ بڑے ہوتے ہیں اور ان کا قطر بھی زمین

سے بہت زیادہ ہوتا ہے مگر ان کا وزن بہت کم ہوتا ہے اور اسو جہ سے جب زمین ان ستاروں کے جھنڈ سے ہو کر نکلتی ہے تو اُس پر اثر نہیں پڑتا۔ اس کے علاوہ ان ستاروں کی کاربن گیس ایسی نہیں کہ وہ زمین کی وزنی فضا میں گھس سکے۔ اس لئے تصادم سے کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا

لیکن پروفیسر ڈیوڈ ٹاڈ کا خیال ہے کہ اگر کوئی بڑا دُم دار ستارہ زمین سے ٹکر کھا جائے تو اہل زمین کے لئے وہ وقت قیامت کا ہوگا۔ پروفیسر موصوف کے خیال میں تصادم کی وجہ سے ہوا اور پانی دونوں معدوم ہو جائیں گے اور زمین کی سطح راکھ ہو کر رہ جائے گی"

پروفیسر چارلس نینگ کی رائے میں "اگر زمین کا وجود عرصہ تک قایم رہے تو دمدار ستارہ سے اُس کا تصادم یقینی ہے کیونکہ دمدار ستاروں اور زمین کے راستے اکثر ایک دوسرے کے بالکل قریب آجاتے ہیں اور اس طرح سے ستاروں کی گیس اور زمین کی گیس جب ملیں گی تو صورت حال خطرناک ہو جائے گی" ۔۔۔ (اس بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ حیوانات میں بعض اوقات کروروں جانوروں کے مرجانے کے واقعات جو ہم کو بتائے جاتے ہیں ممکن ہے کہ ان کا باعث یہی ہو)

ڈاکٹر رابرٹ اٹیکن کہتے ہیں کہ نظریہ کے اعتبار سے زمین اور دمدار ستارے کے تصادم کا امکان بالکل اسی طرح ہے جس طرح تاش کے کھیل میں ایک آدمی کے پاس پورے تیرہ پتے ایک ہی رنگ کے آجائیں مگر کوئی آدمی اگر لاکھوں برس زندہ رہے اور ہر وقت تاش کھیلتا رہے تو شاید ایک مرتبہ اس کے ہاتھ میں ایسے پتے آجائیں۔ ڈاکٹر موصوف کہتے ہیں کہ اگر ایسا تصادم ہو بھی جائے تو زمین کو تو صرف اُسی جگہ نقصان پہونچیگا جہاں ٹکر لگی ہے مگر ستارہ البتہ نیست و نابود ہو جائے گا۔ لیکن اس قسم کے تصادم کا اثر منحصر ہے ستاروں کے قطر کے تناسب پر بھی کیونکہ اکثر ستاروں کا قطر کئی ہزار میل ہوتا ہے اور بعض کا بہت کم۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ زمین اور ستارے کی گیس ملنے سے نقصان کا ضرور اندیشہ ہے۔ مگر چونکہ خود انسان اس کرۂ ارض پر لاکھوں برس سے بغیر کسی تصادم کے آباد ہے اس لئے کسی نئے تصادم کے اندیشہ سے نہ ڈرنا چاہئے۔ مشرقی آرزونا میں ایک کوہ آتش فشاں ہے جس کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ زمین اور کسی دمدار ستارے کے تصادم کا ثبوت ہو سکتا ہے۔ اس کا قطر تقریباً پون میل ہے۔ اس رقبہ میں لوہے کے بہت سے ذرات پھیلے ہوئے ہیں مگر یہاں آتش فشاں کا کوئی ثبوت نہیں پایا جاتا اس لئے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یا تو کوئی تصادم کسی معمولی دمدار ستارے سے ہوا ہے یا چھوٹے تاروں کے کسی جھنڈ سے۔ اس دمدار ستارے یا تاروں کے جھنڈ معلوم کرنے کی بھی کوشش کی گئی مگر پہلی کوشش تو ناکام ہوئی اب پھر سعی جاری ہے کہ اس آتش فشاں کے اندر سے کسی ستارہ کا پتہ لگے۔

۲۵ جون ۲۱ء کو ایک دمدار ستارہ زمین کے راستہ کے بالکل قریب آگیا تھا۔ اُسوقت زمین جو ۱۵۹۸۰۰۰ میل فی یوم کی رفتار سے اپنے راستہ پر چل رہی تھی اُس ستارہ کے راستہ سے کئی لاکھ میل دور تھی اور اُسوقت اُس ستارہ کی رفتار ۴۰ میل فی سکنڈ تھی۔ اگر یہ ستارہ اور زمین ایک ہی وقت میں ایک ہی مقام پر پہونچ جاتے اور تصادم ہو جاتا

تو کیا نتیجہ برآمد ہوتا۔ اس میں اختلاف ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس میں بہت زہر آلود قسم کی گیسیں پائی جاتی تھیں اور وہ یقیناً زمین کی فضا میں سرایت کر جاتیں۔ ڈاکٹر کرامن کی رائے ہے کہ گو زمین اور کسی دمدار ستارہ کے تصادم کا امکان نہایت ضعیف ہے مگر ۱۸۲۱ء میں بہت قوی ہو گیا تھا۔

ایک اور دمدار ستارہ جو ایک مرتبہ زمین سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گیا بیلا ستارہ (Beila's Comet) کے نام سے مشہور ہے ۱۸۲۶ء میں اس ستارہ کا راستہ زمین کے راستہ سے صرف ۲۰ ہزار میل کے فاصلہ پر رہ گیا تھا۔ اسکے بعد اُسکے سر کے دو ٹکڑے ہو گئے ایک مرتبہ دونوں ٹکڑوں کے درمیان روشنی کی ایک محراب دکھائی پڑنے لگی مگر اس ستارے کے قطر کا ایک زمانہ میں ۴ ہزار میل سے زیادہ تھا کچھ عرصہ کے بعد اس کے پھر دو ٹکڑے ہو گئے جن کے مابین لاکھوں میل کا فاصلہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے یہ دونوں ٹکڑے پھر نہیں دکھائی پڑے گو وہ ایسے مقام پر آئے ضرور ہوں گے جہاں سے اُن کو دیکھا جا سکتا تھا مگر کسی نے ان کا مشاہدہ نہیں کیا۔ ۱۸۸۵ء میں میکسیکو میں ایک چھوٹا شہاب ثاقب (Meteorite) گرا تھا اور اس کے متعلق ہیئت دانوں میں یہ بحث آن پڑی تھی کہ وہ اس دمدار ستارہ کا ٹکڑا تھا یا نہیں۔

دُمدار ستاروں کی دُم اور زمین

گو یہ سوال بحث میں آسکتا ہے کہ زمین اور دمدار ستارے کا کبھی تصادم ہوا ہے یا نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ہماری زمین پر اکثر دمدار ستاروں کی دُم اور ان کی روشنی چھا چکی ہے مگر دن میں آفتاب کی تیز روشنی کی وجہ سے ستارہ کی روشنی اچھی طرح نہیں معلوم ہو سکی البتہ شام کے بعد اُس روشنی کا اثر فضا پر ضرور رہا۔ ۲۹ رجون ۱۸۶۱ء کو زمین پر ایک دمدار ستارہ کی روشنی کا عکس پڑا۔ دوسرے روز یہ روشنی اور زیادہ تیز معلوم ہوئی تھی۔ اس روشنی کے بارہ میں ہیئت دانوں نے لکھا ہے کہ سورج کی روشنی اُسوقت کم ہو گئی تھی۔ ۸ راگست ۱۹۲۱ء کو بھی اسی طرح ایک مرتبہ پورے آسمان پر روشنی چھا گئی اور لوگ سمجھ گئے کہ یہ کسی دمدار ستارے کی دُم ہے۔ اس ستارے کو کئی آدمیوں نے دیکھا بھی تھا مگر اس کے متعلق اور زیادہ نہیں معلوم ہو سکا۔

دمدار ستاروں کی دم اپنے طول کے لحاظ سے ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ اُس کا طول ۵۰ لاکھ میل سے لیکر ۲۰ کرور تک ہوتا ہے اور قطر ۱۰ لاکھ میل سے ۱½ کرور میل تک۔ مگر اکثر "دمدار ستارے" ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے دم ہی نہیں ہوتی اور اس قسم کے بے دم "دمدار ستاروں" کی تعداد دم رکھنے والے ستاروں سے زیادہ ہے۔ عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بغیر دُم والے "دمدار ستارے" دوربین کی امداد کے بغیر بہت کم دکھائی پڑتے ہیں اور جب یہ دمدار ستارے آفتاب سے بہت دور ہو جاتے ہیں تو ان کے دم نہیں رہتی۔ مثلاً جب ڈی وگو کا ستارہ پھر نظر آئے گا تو پہلے وہ دوربین سے ایک دھندلی سی چیز معلوم ہوگا اس کے بعد اُس میں ستارہ کی چمک پیدا ہوتی جائے گی۔ جب وہ ہمارے کرہ کی طرف تیزی سے بڑھنا شروع ہوگا تو اس کی وہ گیسیں جو کمی حرارت کی وجہ سے منجمد ہو گئی تھیں سورج کی کرنوں کی حدت کی وجہ سے پھیلنا شروع ہوں گی۔ سورج کی گرمی سے وہ ہائڈروکاربن یا دوسرے مادے جن میں ستارہ کا سر محصور ہے

بھاپ بن جائیں گے۔ اس کے بعد ستارہ کی خاک کے چھوٹے چھوٹے ذرات کشش کی وجہ سے پہلے آفتاب کی طرف کھنچیں گے اور پھر سورج کی بلکی لہروں کے دباؤ سے پیچھے ہٹیں گے۔ چنانچہ یہی وہ مادہ ہے جو بہ یک وقت سورج سے روشنی بھی پاتا ہے اور اُس کی وجہ سے پیچھے بھی ہٹتا ہے اور جس کی وجہ سے دمدار ستاروں کی "دم" تیار ہوتی ہے۔

روشنی کے دباؤ کے اثرات

یہ حقیقت کہ دمدار ستاروں کی دم کا اصل محرک سورج ہوتا ہے سب سے پہلے چینیوں نے نویں صدی عیسوی میں دریافت کی تھی۔ ۱۶۱۹ء میں کیپلر نے یہ نظریہ پیش کیا کہ دمدار ستاروں کی دُموں کی رجعت کا باعث آفتاب کا بیرونی دباؤ ہے۔ نیوٹن نے بھی اس نظریہ کی تصدیق کی ہے۔ مگر قدرت کی یہ شعبدہ کاری زمانۂ موجودہ تک ایک راز ہی رہی البتہ اب تازہ ترین نظریہ یہ پیش کیا گیا ہے کہ آفتاب کے گرد بجلی کا ایک بڑا حلقہ موجود ہے جس میں نہایت زبردست "قوتِ دافعہ" موجود ہے اور اسی سے لئے دُمدار ستاروں کی دُم سورج کے خلاف سمت میں ہوتی ہے

مشہور روسی ہیئت داں پروفیسر بریڈشن نے دمدار ستاروں کی دموں کی تین قسمیں کی ہیں۔ ایک وہ جو طویل اور سیدھی شعاعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں جو مادہ ہوتا ہے اس پر سورج کی قوت اتنا اثر کرتی ہے کہ اس مادے کے ذرات ستارے کو ۴ یا ۵ میل فی سکنڈ کی رفتار سے چھوڑنے لگتے ہیں۔ چونکہ ہائڈروجن سب سے ہلکی گیس شمار کیجاتی ہے اس لئے پروفیسر موصوف کے خیال میں اس قسم کے ستاروں میں یہی گیس پائی جاتی ہے

دوسری قسم خمدار دموں کی ہے جن میں پروفیسر موصوف کے نزدیک ہائڈرو کاربن بخارات پائے جاتے ہیں

تیسری قسم چھوٹی اور گھنی دُموں کی ہے۔ ان میں پروفیسر مذکور کے خیال میں لوہا۔ کلورین اور سوڈیم کا مرکب پایا جاتا ہے۔

جب کوئی دمدار ستارہ سورج سے دور ہوتا ہے اور صرف اس کا بیضاوی سر نظر آتا ہے تو اُس پر کسی "ثابت" یا سیارہ کے ہونے کا دھوکا ہوسکتا ہے۔ سورج کے قریب پہونچنے پر سر سے روشن مادہ کے تار نکلنا شروع ہوتے ہیں جو بہت سرعت سے آفتاب کی طرف بڑھنا شروع ہوتے ہیں۔ یہ مادے گیسیں یا بخارات ہوتے ہیں اسی لئے آفتاب ان کو پھر پلٹا دیتا ہے

ستارے اکثر نصف کرۂ ارض کے ایک نصف حصہ سے دوسرے نصف حصہ کی طرف آتے جاتے رہتے ہیں بعض وقت وہ سورج سے بہت قریب آجاتے ہیں اور بعض وقت بہت دور ہوجاتے ہیں۔ جب وہ سورج کی شعاعوں میں سے گزرتے ہیں تو ان میں زیادہ روشنی پیدا ہوجاتی ہے۔ ستاروں کی دُمیں ایک سے زیادہ بھی ہوتی ہیں، چنانچہ ۱۷۴۴ء کے دُمدار ستارے کی چھ دُمیں تھیں جو پنکھے کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد وہ ستارہ جوں جوں آفتاب سے دور ہوتا گیا دمیں غائب ہوتی گئیں

دُمدار ستارے کیا ہیں؟ اب یہ عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ دمدار ستاروں کے سر مشتمل ہوتے ہیں ٹھوس ذرات پر جو مختلف گیسوں سے مرکب ہوتے ہیں۔ ان ذرات کی روشنی کا باعث ایک حد تک تو آفتاب کی روشنی ہے اور دوسرے خود ان ذرات میں برقی اثرات موجود ہیں جو روشنی دیتے ہیں۔ ان ستاروں کی دموں میں جو بخاری مادہ ہوتا ہے وہ چند سیر سے زیادہ نہیں ہوتا کیونکہ اُس میں کسی قسم کے ٹھوس ذرات نہیں ہوتے مگر سر میں گیس کے ذرات، چھوٹے چھوٹے تاروں کے جھنڈ، خاک کے ذرات اور چھوٹے بڑے، ہلکے اور وزنی ریگ کے گولے کثیر تعداد میں شامل رہتے ہیں۔ گو دمدار ستارہ کے سر کا قطر آفتاب کے قطر سے ۱۰ گنا زیادہ ہو سکتا ہے (مثلاً سنہ ۱۸۱۱ء کے ستارہ کا) مگر عموماً اس کا قطر ۲۵ ہزار میل سے ایک لاکھ میل تک ہوتا ہے۔ ایسے بھی دُمدار ستارے پائے جاتے ہیں، جس کا قطر ۱۵۰ لاکھ میل ہے گو ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اپریل سنہ ۱۹۱۰ء میں ہیلے کے دمدار ستارہ کا قطر ا لاکھ ۹۲ ہزار میل تھا۔ سنہ ۱۸۳۵ء میں اسی مشہور ترین ستارہ کا قطر ۳ لاکھ، ۵ ہزار تھا۔

اب تک جتنے دمدار ستاروں کا علم ہو چکا ہے ان میں سے کسی ستارے کا وزن کرۂ ارض کے ۱/۱۰۰ حصہ تک بھی نہیں پہونچا ہے اور اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ دُمدار ستارہ کا سر بالکل کھوکھلا ہوتا ہے۔ اس کی مزید تشریح یوں کی جا سکتی ہے کہ دمدار ستاروں کا حجم اُس لوہے کے گولے کے برابر بھی نہیں ہے جس کا قطر ۱۵۰ میل ہو۔

آپ کے فائدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علٰحدہ علٰحدہ خرید فرمائیں گے تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑیگی اور محصول علاوہ بریں:۔

نگارستان	جمالستان	ترغیبات جنسی	شہاب کی سرگزشت	استفسار و جواب ہر دو جلد
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	چھ روپیہ
معرکۂ سخن	مکتوبات نیاز	اُردو شاعری	ہندی شاعری	میزان کل
ڈھائی روپیہ	ڈھائی روپیہ	دو روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	چوبیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف اٹھارہ روپیہ میں مل جائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

منیجر نگار لکھنؤ

اُردو غزل میں اخلاقیات

(پروفیسر فراؔق کی وہ تقریر جو دہلی ریڈیو اسٹیشن سے ۱۴ر جنوری ۱۹۳۸ء کو نشر ہوئی)

آپ اس عنوان میں اخلاقیات کا لفظ سنکر ڈریں نہیں۔ میں آپ کو ایسے شعر نہ سناؤں گا جو آپ کو بدمزہ کریں۔ مثلاً

"ہے امتحاں سر پہ کھڑا محنت کرو محنت کرو" یا

"سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا" یا

"بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا"

حالانکہ یہ مصرعے بھی اتنے بُرے نہیں جتنا میں نے بتایا ہے۔ آج تو ہم گناہگاروں کی سی باتیں کریں گے کیونکہ نہ ہم واعظ ہیں نہ فرشتے۔

اُردو شاعری جتنی عجیب وغریب چیز رہی ہے اس سے تقریباً اتنی ہی عجیب وغریب وہ رائیں اور تنقیدیں بھی ہیں جو شاعروں سے لیکر مسجدوں اور خانقاہوں تک اکثر سُننے میں آتی ہیں۔ ایک دن ایک مشاعرے کے قبل مجھ سے ایک بزرگ ملے جو بڑے شاعر تھے۔ کہنے لگے کہ آج کل "مذاق سلیم" والے عجب مصیبت کئے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ غزل میں وصل کا ذکر نہ ہو، دل، جگر کا ذکر نہ ہو۔ بھلا بتائیے کہ ہم غزل میں وصل، دل اور جگر کا ذکر نہ کریں تو کریں کیا۔ میں نے عرض کیا کہ وصل تو جھگڑے کی چیز ہے، دل و جگر کو بھی لوگوں نے بہت چھیڑا ہے۔ لیکن آپ گُردوں اور پھیپھڑوں کا ذکر ضرور کیجئے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ میری رائے ناقص کا ان پر کیا اثر ہوا کیونکہ شاید وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ میری بات پر ہنس پڑیں یا بگڑ جائیں۔ اُردو کیا، عربی اور فارسی شاعری کو بھی ڈاکٹر نذیر احمد زہر بتا چکے ہیں۔ غزل تو خیر غزل ہی ہے۔ انیسؔ اور دبیرؔ کے وہ مرثیے جو ثواب دارین حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں دورِ حاضر میں انھیں بھی مضرت رساں اور خطرناک بتانے والوں کی کمی نہیں۔ یہی نہیں بلکہ "اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے" مولانا حالی نے شاعر ہوتے ہوئے ہماری شاعری کے لئے یہ کہہ دیا کہ "عفونت میں سنڈاس سے بھی ہے بڑھکر"۔ ڈاکٹر اقبالؔ نے حجازیت اور عجمیت کا وہ زبردست مسئلہ اُٹھایا کہ معاذ اللہ! اکبرؔ الہ آبادی کا بھی یہ شعر سنئے:-

ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جانباز کا رنگ　　　دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ

جوشؔ ملیح آبادی اور ان کے ہم نواؤں نے بھی اُردو غزل پر وہ شرربار یاں کیں کہ اگر اُردو غزل گوئی اتنی تر دامن نہ ہوتی تو یقیناً آگ لگ جاتی

رہے ہم اور آپ تو جن حضرات کا ذکر اوپر آچکا ہے ان سے اُلجھ پڑنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ ایک بات کہہ رہا ہے۔ دیکھئے انگریزی شاعری پر کیا کیا گلفشانیاں ہوئی ہیں شیکسپیر کے ناٹکوں کو ٹالسٹائے نے مخربِ اخلاق بتایا۔ ملٹن کی "فردوسِ گم شدہ" میں سب سے زیادہ دلفریب کردار شیطان کا بتایا جاتا ہے۔ سر والٹر اسکاٹ کے یہاں کہا جاتا ہے کہ اس کے جرائم پیشہ کردار سب انعامات لے اُڑتے ہیں (the redem run away with all the prizes.) پوپ کے یہاں میتھو آرنلڈ نے تنقیدِ حیات اور بلند سنجیدگی (High seriousness) کی کمی پائی۔ ورڈس ورتھ کو شیلی نے اخلاقی خواجہ سرا (Moral eunuch) بتایا۔ بایرن کے لئے ساودے نے شیطانی اسکول آف پوئیٹری کے الفاظ استعمال کئے۔ ٹینی سن کی (In Memorium) کے پاکیزہ ترین اشعار کیلئے یہ کہا گیا کہ یہ امرد پرستانہ جذبات ہیں اور سون برن کو تو لارڈ مارلے نے سوائن بارن (Swine born) ہی لکھ دیا تھا۔

آپ نے دیکھا کہ یہ مصیبت صرف اُردو شاعری پر نہیں آئی۔ دنیا بھر میں شاعری کو کبھی سراہا گیا ہے کبھی کوسا گیا ہے۔ دنیا کی مذہبی کتابوں نے تمدنِ انسانی کی شیرازہ بندی نغموں سے کی، انجیل مقدس کا ایک حصہ غزل الغزلات ہے۔ شام وید سراسر نغمہ ہے۔ اور قرآن پاک میں کوٹ کوٹ کر فصاحت و بلاغت بھری ہوئی ہے۔ دیوان حافظ سے لوگ فال نکالتے ہیں مفکروں میں دیکھئے کہ افلاطون زبردست شاعر ہوتے ہوئے بھی اپنی ریپبلک سے شاعروں کا اخراج چاہتا ہے اور ارسطو عالم و مدبر ہوتے ہوئے شاعری کی تعریف میں قلم توڑ دیتا ہے۔ جنرل وولف گور غریباں پر انگریزی شاعر گرے کی نظم کا ایک بند پڑھتے ہوئے کہ اُٹھا کہ بجائے کو میبک فتح کرنے کے کاش میں ان اشعار کا مصنف ہوتا۔ ابھی حال میں نپولین بوناپارٹ کے کچھ اشعار ملے ہیں۔ اب شعر و نغمہ کو ہم کیا سمجھیں؟ ان کی بوالعجبی کو کیا کہا جائے؟

وقت گزر جاتا ہے اور بات رہ جاتی ہے۔ رائے دینے والے رائے دے گئے۔ لیکن شاعری اور اخلاقیات کی بات رہ گئی۔ مشہور لاطینی خطیب سیسرو جب کوئی تقریر کرتا تھا تو اہل روم کہتے تھے واہ کتنی فصیح و بلیغ اور شاندار تقریر ہے اور جب مشہور یونانی خطیب دیماستھنیز تقریر کرتا تھا تو اہل ایتھنس کہہ اُٹھتے تھے کہ آؤ سپارٹا والوں پر ٹوٹ پڑیں، زبان و بیان کی تعریف نہیں کرتے تھے۔ اب آپ محاسن شاعری ان دونوں میں کس کے یہاں بتائیں گے۔ اگر آپ سیسرو کے طرفداروں میں ہیں تو شاعری اور اخلاقیات کی بحث پر ممکن ہے آپ کہہ اُٹھیں کہ مارے گھٹنا پھوٹے آنکھ یعنے ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا، یعنی کہاں شاعری کہاں اخلاقیات ؟ بات کیا ہے ؟ یہ کہ کائنات کو بھی ہم سراسر عمل سے

تعبیر کرتے ہیں، کبھی سراسر شعر و نغمہ سے اور کبھی وجود محض سے اور کبھی --- بیک وقت تینوں سے جب حقیقت، نیکی اور حسن ایک معلوم ہونے لگتے ہیں۔

کیا آپ کے تجربہ یا تصور میں کوئی ایسا شخص نہیں جو یوں تو نیت و عمل، دین و دنیا ہر لحاظ سے بے عیب ہے۔ کوئی جرم یا گناہ نہیں کرتا، سخت کلامی نہیں کرتا، نشہ نہیں کھاتا، زنا نہیں کرتا، فرض اور وقت کا پابند ہے دیانت دار ہے اتنا ہی نہیں بلکہ خیرات بھی کرتا ہے اس میں ایثار بھی ہے بے نفسی بھی۔ یہ سب کچھ ہے لیکن آپ تو کیا اس کے بی بی بچے بھی اس سے چونکتے ہیں اس سے بچتے ہیں، وہ فرشتہ صفات ہوتے ہوئے بھی شیطان معلوم ہوتا ہے۔ اس سے ملنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ کیوں، اس لئے کہ بقول غالب

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا،

ایسا شخص محض ادائگیِ فرض اور عمل کی مشین بن گیا ہے۔ اس میں انسانیت نہیں، اس کی شخصیت خشک ہے، اس شخص میں دلفریب کمزوریاں نہیں، وہ کھل کر ہنستا بھی نہیں اُسے کھل کر غصہ بھی نہیں آتا، طبیعت میں گداز نہیں، محبت نہیں، اس کے خدمات اور احسانات ہماری خودداری کی توہین کرتے ہیں۔ ہندوستان کا مشہور شاعر تلسی داس کہہ گیا ہے:-

آوت ہی ہرکھے نہیں نینن نہیں سنیہہ تلسی وہاں نہ جائے کنچن برسے مینہہ

یہ شخص ہمہ تن عمل ہوتے ہوئے بھی مردہ ہے، اس نے خیر کو شر بنا دیا ہے۔ جی۔ کے چسٹرٹن نے لکھا ہے کہ اگر انگلستان کے محتاج خانوں کے غریب آزاد ہو جائیں تو سب سے پہلے وہ خدام قوم یعنی نیکی کرنے والوں (Philanthropists) کو قتل کر ڈالیں گے۔ آپ نے کبھی کسی ٹمپرنس پریچر (Temperance Preacher) کو دیکھا ہے؟ پھر مجھ سے زیادہ کیوں کہلواتے ہیں؟۔ ایک شخص ہوس پرست ہے نفس پرست ہے۔ خیر وہ تو برا ٹھہرا۔ لیکن اخلاق، مذہب شرع، دھرم شاستر اور انصاف کے نام پر اُسے اتنے کوڑے لگوانا کہ وہ مر جائے، اسے آپ کیا کہیں گے۔ اخلاق کے نام پر جو بد اخلاقیاں ہوئی ہیں وہ بھولنے کی چیزیں نہیں ہیں۔ اخلاقیات محض عمل کا نام نہیں۔ فعل اور اخلاق (Conduct اور Character) میں فرق ہے۔ ایک آدمی اچھے کام کرتا ہوا برا آدمی ہو سکتا ہے اور ایک آدمی عملی کمزوریوں کے باوجود اچھا آدمی ہو سکتا ہے۔ جذبات یعنی شعریت اور وجدانیات و جمالیات سے، اخلاقیات کا گہرا تعلق ہے۔ آدمیت اور اسے نیک عملی ہے۔ ہیولاک ایلس اپنی کتاب رقصِ حیات (The Dance of Life) میں لکھتا ہے کہ آرٹ میں اخلاق سے زیادہ خُلق ہے (Art is more moral than morality)۔ گوئٹے (Goethe) اُنیسویں صدی کا سب سے زبردست دماغ تھا۔ وہ کہتا ہے کہ فطرت نے ہم میں کوئی ایسا عیب نہیں پیدا کیا جو حسن نہ ہو سکے اور کوئی ایسی نیکی نہ دی جو عیب نہ بن سکے اور حقیقتاً یہ نیکیاں عیوب سے زیادہ خطرناک ہیں۔ اب آپ نے دیکھا کہ انسانیت ذا ٹیڑھی کھیر ہے۔ اس بحث کو یہیں چھوڑئے۔

اخلاقیات کا سوال کتنا نازک، اہم اور پیچیدہ ہے اس کا خیال رکھتے ہوئے اب دیکھئے کہ اُردو غزل اس مسئلہ پر کیا روشنی ڈالتی ہے۔ مولانا حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں بتایا ہے کہ جب مذہب و اخلاق کے علمبردار، فطرت انسانی پر ظلم ڈھانے لگے جب انھوں نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو زنجیروں میں جکڑنا چاہا جب انھوں نے اخلاقیات کو کانسنٹریشن کیمپ بنا دیا تو ایران میں حساس اور روشن خیال ہستیوں نے علم بغاوت بلند کیا اور فارسی شاعری میں دن دہاڑے رندی مستی اور گناہ کی تعریفیں ہونے لگیں۔ شیخ، واعظ، زاہد اور پارسا، مسجد اور حرم یہاں تک کہ قرآن اور خدا پر بھی چوٹیں ہونے لگیں۔ خمریات کا فارسی شاعری میں آغاز ہوا عقل و جنون، ہوش اور مستی، شریعت اور حقیقت، کفر و ایمان کی بحث چھڑ گئی۔ لامذہبی کی کھلم کھلا مدح سرائی ہونے لگی۔ جب اُردو غزل کا آغاز ہوا تو یہاں کے شعرا نے بھی فارسی شعراء کی آواز سے اپنی آواز ملا دی۔ میر کہتے ہیں:۔

واعظ ناکس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میر ۔۔۔ آؤ میخانے چلو تم کس کے کہنے پر گئے،

یہ اشعار بھی سن لیجئے:۔

دیر کی راہ نہ ملتی ہو تو کعبہ ہی سہی ۔۔۔ کفر اگر کفر نہ بنتا ہو تو ایماں کر دے

اے محو ذوقِ جرم بدلنا جو کروٹیں ۔۔۔ دنیا کی بھی نجات کا پہلو لئے ہوئے

حشر ہے واعظ یہاں ہر بات کا ہو فیصلہ ۔۔۔ لا کوئی حسن عمل میری خطا کے سامنے

شاعری کے یہ نعرے کسی نعرۂ انقلاب سے کم فتنہ انگیز نہ تھے۔ کوئی چاہے تو ان اشعار کو بدکاری کی ترغیب سمجھے لیکن فارسی اور اُردو غزلوں کے یہ وجد آور نغمے کیا خباثت، رذالت اور ذلت کے جذبات سے پیدا ہو سکتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شیطان سب کچھ کر سکتا ہے لیکن وہ گا نہیں سکتا۔ یہ انقلابی نعرے اس جنگ کے اعلان تھے جسے میتھیو آرنلڈ نے عبرانیت اور یونانیت (Hebraism & Hellenism) کی جنگ بتائی ہے اور واعظ، شیخ، زاہد، پارسا قاضی، مفتی اور علماء دین کے رویہ اور نظریہ کو فلسطینیت (Philistinism) کہا ہے۔

فارسی شعرا نے اور ان سے علم سینہ کے طور پر اُردو شعرا نے اس راز کو سمجھ لیا کہ اخلاقیات کی بنیاد حلال و حرام کے احکام پر شرع اور مذہب پر، ضابطۂ فوجداری، پولیس اور خفیہ پولیس، عدالت اور جیل خانوں اور رائے عامہ یا پبلک تعصب پر نہیں رکھی جا سکتی خواہ یہ بدعتیں نظام تمدن کے لئے کتنی ہی ضروری ہوں۔ نہ اخلاق انسانی کی بنیاد دنیاوی یا مادی کامیابی اور نیک نامی پر رکھی جا سکتی ہے۔ زندگی بڑی مردہ چیز ہے، اس کی بے حسی اور اس کا جمود موت سے بدتر ہے۔ زندگی کو حساس بنانے کی ضرورت ہے، اس میں سوز و ساز کیف و اثر وجدانیات اور جمالیات کے تاثرات پیدا کرنے کی ضرورت ہے، حیات کے ارضی اور سماوی اجزا میں امتزاج پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اُسے آزاد اور رواں دواں بنانے کی ضرورت ہے، اس میں لوچ اور رنگینی اور اُبھار پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ خواہشات اور نفس انسانی کے

مطالبات کا احترام ضروری ہے۔

اس میں شک نہیں کہ رندی بدمستی گناہ اور کفر کے موضوع اکثر محض رسمی اور برائے بیت ہوکر رہ گئے۔ فن کے لحاظ سے مکمل اور اُستادانہ شعر توان عنوانات پر بہت مل جائیں گے لیکن روح شاعری اور حقیقت کی ترجمانی ذرا مشکل کام ہے لیکن اس طرح کے اشعار جہاں کامیاب ہوگئے وہ کفر کا کلمہ پڑھتے ہوئے بھی انسان کو انسان بناتے ہیں اور درس حیات دیتے ہیں۔ کائنات اور حیات پر اُردو کا شاعر خمریات اور کفریات کے پردے میں جو حکم لگاتا ہے وہ فکر انسانی کے آخری منازل کی خبر دیتے ہیں۔ سماج کا کوئی فلسفہ اتنا ہمہ گیر نہیں ہوسکتا جتنے ہمہ گیر بزم ساقی کے آئین ہیں۔

ہاں تو انسان کے لئے سب سے ضروری چیز زندہ انسان ہونا ہے۔ اسٹیونسن نے لکھا ہے کہ مردہ ہونے سے مجرم (Criminal) ہونا اچھا ہے۔ براؤننگ لکھتا ہے کہ ہر ناکامیاب ہستی پر میرا یہی الزام ہے کہ اس نے اپنی شمع روشن نہ کی اور اپنی کمر نہ کسی خواہ اس کا مقصد جرم ہی کرنا رہا ہو۔ اب اگر کوئی کہے کہ کفر اور رندی و مستی کے کامیاب اشعار بھی مخرب اخلاق ہیں یعنی ایسا شعر بھی کہ :-

زمانہ آئے گا مے پرستی کا عام دیدار یار ہوگا ۔۔۔ بنے گا سارا جہاں میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

تو اس شخص پر ترس کھانے کے علاوہ ہم اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتے۔ جن کے اخلاق اشعار سے بگڑ جائیں ان کا خدا ہی حافظ ہے۔ رہی ہوسناکی اور ہوس پرستی تو یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ دنیا کی رنگا رنگ بزم آرائیاں دیکھ کر نفس کی چنگاریاں اپنے اندر رکھتے ہوئے بدن میں پھُریری تک نہ آئے۔ اسٹیونسن ہی کا قول ہے کہ شیطان سے جن لوگوں کی ملاقات کے کامیاب ہونیکا احتمال ہے انھیں شاید نہ بچانا ہی اچھا۔ اکثر اخلاقیات کے پردے میں دنیا پرستی ہوتی ہے۔ بے اختیار ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک لڑکے کے چچا نے اُسے نصیحت کرنی شروع کی۔ کہنے لگے کھیل کود سے کیا فائدہ تھیٹر اور سینما سے کیا فائدہ بیچ دیکھنے سے اور سیر سپاٹے سے کیا فایدہ؟ لڑکا تھا کھلاڑی مگر ذہین۔ اس نے کہا چچا یہ تو سب صحیح ہے لیکن فائدہ سے کیا فایدہ؟ اسکے برعکس ایک واقعہ سنئے۔ ایک صاحب تھے جن کی شخصیت بالکل پھُسپھُسی تھی۔ نیستی ان کے وجود پر رشک کرتی تھی ان کے خاندان کے ایک بزرگ بیزار ہوکر کہہ اُٹھے کہ تم تو کچھ نہ ہوئے تمھیں بُرا ہونا بھی نہ آیا۔ بہر حال یہ درخشاں خصوصیت صرف فارسی اور اُردو شاعری میں ہے کہ یہاں گناہ کے نام سے اخلاقیات کی تعلیم دی گئی اور کچھ ہے بھی ایسا ہی کیونکہ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی۔ اناطول فرانس کا قول ہے کہ ولی کا ایک ماضی ہوتا ہے اور گنہگار کا ایک مستقبل۔ (The saint has a past, the sinner has a future) زندگی زندگی ہے، کام نہیں ہے۔ عمل مقدم سہی لیکن بے عملی کے بغیر بھی کام نہیں چلتا۔ یاد رہے کہ عمل زندگی کو مردہ اور بے حس اور بیکار بنانے میں کاہلی یا بےکاری سے کم نہیں۔ ہماری یونیورسٹی میں ایک پروفیسر ہیں جو میرے دوست ہیں اور جن کی میں عزت کرتا ہوں۔ ایک بار یونیورسٹی میں ایک نہایت خوبصورت آرام کرسی کو وہ بہت للچائی ہوئی اور پُرحسرت نگاہوں سے دیکھ

رہے تھے - میں نے کہا کیا بات ہے؟ کہنے لگے میں بھی ایسی کرسی خریدتا اور گھر پر رکھتا لیکن کام سے کہاں فرصت کہ اس پر آرام سے بیٹھ کر ذرا کمر سیدھی کروں - میں نے کہا یوں کہئے کہ کام سے اتنی فرصت کہاں کہ آدمی بن سکیں، بلیک نے کہا ہے لعنت ہو تمام بندشوں پر رحمت ہو تمام گرہ کشائیوں پر (Curse all braces bless all relaxes) - بے عملی گلزار تمدن کا حسین ترین پھول ہے - آدمی کو کھیلنے کھانے ہنسنے بولنے دیجئے وہ اچھا آدمی بھی بن لیگا - ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا ہے کہ سب سے زیادہ اپنا وقت خدا ضایع کرتا ہے۔ زندہ اور جاندار بے عملی بہت تربیت یافتہ شخصیت چاہتی ہے۔ اور یوں تو عمل کو کون بُرا کہتا ہے؟

اُردو شاعری نے اخلاق انسانی کو سنوارنے کے لئے سب سے زیادہ ضروری اسے سمجھا کہ انسان میں مذاقِ زندگی پیدا کیا جائے - کفر و گناہ کا اور کوئی مفہوم نہیں - اس نے انسان میں ایک ایسا مزاج پیدا کرنا چاہا جو جمالیات اور وجدانیات کے تاثرات سے محروم نہ رہے اور یوں تو روحانیت، پاکیزگی، خودداری، سپردگی، خستگی، بے نفسی، اولوالعزمی، ترک و غنا، فقر و فنا، بلند نظری اور بلند حوصلگی، درس عمل، درس عبرت، نور و ظلمات، یگانگی، بیگانگی، وحشت اور مانوسیت، بے نیازی اور لگاوٹ، شکر و شکایت، خلوص اور پرکاری، سادگی اور رنگینی، عصیاں اور شرم عصیاں، بیم و رجا، تسلیم و رضا، یاس و امید، تڑپ اور سکون غرضکہ وہ تمام صفات جن سے انسانیت کو سنوارا جا سکتا ہے، ان سب پر ایسے اشعار اُردو غزل میں ملتے ہیں جنھیں آپ شاعری کے انمول موتی کہہ سکتے ہیں - لیکن ہر طرح کی ریاضت اور (Sublimation) کی تعلیم دیتے ہوئے اُردو شاعری کا مرکزی رجحان رموزِ نفس کی طرف رہا ہے جو اس خمسہ کی توہین فطری جذبات اور فطری خواہشات کی توہین جسمانی حُسن اور اس سے برانگیختہ ہونے والے جذبات کی توہین اُردو شاعری کی روایات میں نہیں رہی - وہ ہم کو دنیا، رنگ و بو کی سیر کراتی ہوئی اس دنیا سے آگے لے جاتی ہیں - کہا جاتا ہے کہ کامل فقیر جنھیں فقر اور روحانیت کے رموز سے واقف کرانا چاہتے ہیں انھیں پہلے کیمیا سکھا دیتے ہیں - اچھا اب کچھ اشعار سنئے :-

خلوص اب ہم یہ لائیں گے کہاں سے　　نکل کر حلقۂ پیر مغاں سے　　حسرت موہانی

بڑی احتیاط طلب ہے یہ جو شراب ساغرِ دل میں ہے　　جو چھلک گئی تو چھلک گئی جو بھری رہی تو بھری رہی　　بے نظیر شاہ

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام　　آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا　　میر

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر　　مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا　　"

باغِ عالم میں بڑی چیز ہے یہ اے بلبل　　گُل تو گُل خار سے بھی رابطہ پیدا کرنا　　رواں

امیدوارِ رہائی قفس بدوش چلے　　جہاں اشارۂ توفیقِ غائبانہ ملا　　یاس یگانہ

ٹھٹھک رہے حرم و دیر کے دوراہے پر　　خلاف جادۂ سیکے شاہ راہِ فطرت کے　　"

تو آپ اپنی ہے شمشیر آپ اپنی سپر	یگانہ باگ اُٹھا اپنے بل پہ کستا جا	یاس یگانہ
میری ہستی شوقِ پیہم میری فطرت اضطراب	کوئی منزل ہو مگر گزرا چلا جاتا ہوں میں	جگر
چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے	اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے	اصغر
یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے ناکامی	جو بڑھکر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے	شاد
تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں	کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں	”
بعد اِک عمر بھی جینے کا نہ انداز آیا	زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا	”
سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم	ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے	حالی
عین پستی ہے کہ پستی کو بلندی سمجھا	اب بھی احساس ہو اس کا تو ابھرنا ہے سہل	مولانا محمد علی جوہر
تمام رات ستاروں نے مجھ کو سمجھایا	کہ فکر کر کوئی دنیا نئی بسانے کی	اعجاز
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر	نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے	غالب
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم	اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا	”
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے	پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے	”
جب جب اسے سوچا ہے دل تھام لیا میں نے	انسان کے ہاتھوں سے انسان پہ جو گزری	فراق
ملے جلے ہیں عذاب و ثواب کے مفہوم	رموزِ عشق میں اے شیخ دینیات نہیں	”
حیات ہو کہ اجل سب سے کام لے غافل	کہ مختصر بھی ہے کارِ جہاں دراز بھی ہے	”
بن تارکِ دنیا بھی دنیا کی طلب بھی کر	ملتے ہوئے دنیا سے بچتے ہوئے دنیا سے	”
سبک روح دنیا سے چھوٹیں گے ہنستے	گراں ہوں گے وہ جن کو ہستی ہے دنیا	عبرت گورکھپوری
زمانے میں جو چیز ہے دیکھنے کی	نہ تم دیکھتے ہو نہ ہم دیکھتے ہیں	”
زندگانی کی حقیقت سے نہیں ہم واقف	موت کا نام جو سنتے ہیں تو مر جاتے ہیں	”
سلامتی کی جنہیں خبر تھی کنارے دریا کے رک گئے وہ	مگر جنہیں خواہش گہر تھی وہ جا گھسے بحرِ پر خطر میں	”
بچنا کانٹوں سے اگر ہو تو لگا تو نہ ببول	پھول کی رکھتے ہو تمنا تو نہ توڑو کوئی پھول	”
احسان ناخدا کے اٹھائے مری بلا	کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں	ذوق
ظفر آدمی اسکو نہ جانئے گا ہو وہ کتنا ہی صاحبِ فہم و ذکا	جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا	ظفر
شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ	قناعت بھی بہارِ بے خزاں ہے	آتش
فقر کے کوچے میں قدرِ دولتِ دنیا نہیں	ٹھوکریں کھاتے ہیں یاں پارس کے پتھر سیکڑوں	”

کفر و اسلام کی کچھ قید نہیں ہے آتش ــــــ شیخ ہو یا کہ برہمن ہو پر انساں ہوئے ــــــ آتش

اخیر کے تینوں شعر آتش کے ہیں۔ صرف آتش کے ایک دیوان میں اخلاقی شاعری کی درخشاں مثالیں ملیں گی آتش اس رنگ کا بادشاہ ہے۔ دورِ جدید میں شادؔ عظیم آبادی نے اتنے بلند اشعار اخلاقیات پر کہے ہیں کہ تہذیب خود ان اشعار پر نازاں ہے۔ اب آپ نے دیکھا کہ اُردو غزل گوئی کا بہترین حصہ کتنی رچی ہوئی چیز ہے۔ اُردو غزل میں براہ راست اخلاقی عنوانوں پر کثرت سے اشعار ملیں گے۔ بادہ و ساغر کہے بغیر بھی اُردو غزلگو شعرا اخلاقیات کے باب میں بند نہیں ہیں۔ ولی کے وقت سے آج تک اخلاقیات پر کھری کھری سنانے والوں کی اُردو شعرا میں کمی نہیں رہی ہے۔ لیکن یہ سمجھنا چاہئے کہ چند نیک خصایل اور نیک اعمال کا جن اشعار میں براہ راست ذکر آیا ہے وہی اخلاقی شاعری کے نمونے ہیں۔ یہ پھر ہوگا کہ اخلاقی شاعری دیکھنی ہو تو اُردو غزل میں عاشقانہ شاعری کے بہترین نمونے دیکھئے آپ دیکھیں گے کہ اُردو کا غزلگو شاعر سامنے کی بات بھی کہہ دیتا ہے اور کبھی کبھی بڑی دور کی کوڑی بھی لاتا ہے اور کبھی کبھی تو اس کی اُنگلیاں ستاروں کو چھوتی اور چاند سے امرت برساتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اخلاق اخلاق کرنے سے اخلاق نہیں سدھرتا۔ نہ شور مچانے سے درس عمل ممکن ہے۔ اس کے لئے اس ہوش اور اس گم شدگی کی ضرورت ہے جو پر خلوص شاعرانہ تخئیل کی جان ہے۔ حُسن اور شعر سے متاثر ہونا خود ایک اخلاقی حالت کی خبر دیتا ہے۔ ارسطو نے متضاد اور متصادم حالتوں کے توازن پر اخلاقیات کی بنیاد رکھی اور افلاطون کا قول ہے کہ اخلاق کے لئے ضروری ہے کہ حُسن کے مناظر اور تصورات و اثرات روح میں ڈوب جائیں۔ رہے وہ لوگ جو حُسن و عشق کفر و مستی اور گناہ کے اشعار کو محض تفنن طبع اور ظرافت کی چیز سمجھے بیٹھے ہیں وہ نہ جانے شاعری کو کیا سمجھتے ہیں۔ رندانہ اشعار تو ایسے ملیں گے کہ جنہیں سُن کر کمینہ فطرت آدمی تلملا اُٹھے، بہرحال اُردو غزل گوئی نے زندگی پر کبھی پھول برسائے اور کبھی چنگاریاں کبھی اس نے زندگی کو فردوس بداماں کر دیا اور کبھی دوزخ بگریباں۔ اب آپ کے اختیار ہے کہ آپ ڈاکٹر نذیر احمد کی رائے اور مولانا حالیؔ کی رائے مانئیں یا ان بزرگ کی جو بغیر وصیں کا ذکر کئے غزل نہیں کہہ سکتے تھے

اب زمانہ بدل چکا ہے اور بدل رہا ہے ہم اس سے زیادہ اس اجمالی بحث میں نہیں کہہ سکتے کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ صرف اچھی شاعری کافی نہیں بلکہ ہماری انفرادی اور سماجی زندگی میں ایسی مادی فضا اور ماحول کی بھی ضرورت ہے جو شاعری کے سماوی نغموں کو قبول کر سکے۔ شاعری تو محض مضراب ہے تار تو ہمیں ہونا ہے۔ اگر دنیا کی تہذیب نے ہمیں شاعری سے صحیح مانوں میں اثر قبول کرنے کا موقع دیا تو ہماری شاعری وہ چیز ہو جائے گی جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے گا کہ :-

نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

فلسفہ کیا ہے؟

فلسفہ کا لفظ ہماری زبان میں نہایت سُست طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اُس کے اس سُست استعمال کی ذمہ داری بڑی حد تک انگریزی زبان پر عاید ہوتی ہے جو ہماری زبان کی سوتیلی ماں ہے۔ معانی کا فلسفہ، عروج و زوال کا فلسفہ اشتقاق کا فلسفہ، محبّت کا فلسفہ، مسرّت کا فلسفہ، رمضان کا فلسفہ وغیرہ ایسے جملے ہیں جن سے ہمارے کان اچھی طرح آشنا ہو چکے ہیں۔ لیکن ان شاندار سرخیوں کے تحت جو چیز پیش کی جاتی ہے اسے فلسفہ سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا فلسفہ انسانی علم کی ایک مخصوص قسم ہے اور میں اس مضمون میں یہی بتلانا چاہتا ہوں کہ وہ کیا ہے؟

فلسفہ کا لفظ ہم کو عربی سے ملا ہے۔ فارسی میں بھی یہ عربی ہی کے توسط سے آیا عربی کو یہ لفظ یونانی زبان سے ملا۔ اور یوروپ کی جملہ علمی زبانوں میں فلسفہ کا لفظ جزئی اختلاف کے ساتھ یونانی زبان سے لیا گیا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے فلسفہ کا یونانی لفظ فیلا سوفیا ایک مرکب لفظ ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی دو ہیں (۱) فیلا اور (۲) سوفیا فیلا کے معنی محبّت کے ہیں اور سوفیا کے معنی دانائی کے۔ یوں پورے لفظ کے معنی ہوئے دانائی کی محبت۔ اس نام سے ایک خاص قسم کی انکساری کا اظہار ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حکمائے یونان کے ایک طبقہ نے فلسفہ کی تعلیم کو وجہ معاش بنا لیا تھا۔ یہ لوگ پھر پھر کر فلسفہ سکھاتے تھے اُنھوں نے اپنا نام سوفسط یا سوفسطائی رکھا تھا۔ اور تاریخ فلسفہ میں وہ اسی نام سے مشہور بھی ہیں۔ اس لفظ کے معنی ہیں دانشور یا صاحب دانش۔ سقراط نے ان کے مقابلہ میں اپنے لئے فلسفی یا فیلسوف کا لفظ استعمال کیا ہے اس کے معنی مُحبِّ دانش کے ہیں۔

فلسفہ کا لفظ یونانی زبان میں پہلی مرتبہ ہیرو ڈوٹس نے استعمال کیا۔ اس سے پہلے اس لفظ کا یونانی میں وجود نہ تھا۔ ہر چند ہرقلیطوس پانٹی کوس یہ کہتا ہے کہ فیثاغورث وہ پہلا شخص ہے جس نے فلسفہ کا لفظ علم کے معنوں میں استعمال کیا۔ مگر یہ قول چنداں معتبر یا مستند نہیں، لیڈیا کا قارون صفت بادشاہ، کری سوس، ایتھنیائی مدبر سولن سے پوچھتا ہے "میں نے سنا ہے کہ تم نے مختلف ممالک کا سفر فلسفیانہ نظر سے کیا ہے" پیریکلیز کی وفات پر تھیوسی ڈائڈیس کہتا ہے "ہم فلسفی ہیں۔ فلسفہ کی مشق کرتے ہیں۔ ہم میں نسائیت نہیں ہے۔ ہم مردِ میدان ہیں"

یہاں تک تو لفظی بحث تھی۔ لیکن فلسفہ اس وقت کے پہلے سے موجود تھا جب کہ اس کے لئے فلسفہ کی

اصطلاح ابھی گھڑی نہیں گئی تھی۔ طالیس ملسطی جس کا زمانہ ۶۴۰ سے ۵۴۶ ق۔م بتلایا جاتا ہے یونان کا پہلا اور مشہور فلسفی ہے۔ ظاہر ہے کہ فلسفہ کا وجود ہیروڈوٹس کی حیات یعنی ۴۸۴ - ۴۲۵ ق۔م کے پہلے سے تھا

فلسفہ کے معنی سچ پوچھئے تو سوچنے کے ہیں۔ اس لحاظ سے فلسفہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ خود انسانی ذہن ارتقاء کا نظریہ آج نہ صرف حیاتیات دانوں ہی کے طبقہ میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ بلکہ دنیا کے جملہ علمی طبقے بھی اسکو مانتے ہیں۔ بہرحال ارتقاء واقع ہوا اب وہ کسی طرح کیوں نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں نہ موجودہ عہد اور نہ کوئی عہد یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ کامل بالذات اور منفصل ہے۔ ایسا کوئی دعوے اگر کبھی کیا بھی جائے تو بے حد مضحکہ خیز ہوگا۔ ہٰذا یہ ماننا ناگزیر ہے کہ فلسفہ کی عمر ڈھائی ہزار سال کی نہیں۔ انسانی نسل کو عالم وجود میں آئے ڈھائی لاکھ سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اس میں شک نہیں کہ اس مدت کا بڑا حصہ کشمکش زیست میں بسر ہوا فطرت کی ہلاک کرنے والی طاقتوں کے مقابلہ میں صرف ہوا۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تنازع للبقاء میں انسان نے دماغ سے کام نہیں لیا۔ فکر خود تنازع للبقاء کا ایک وسیلہ تھا لہٰذا عقل کے لئے بھی سوچنے کی ضرورت تھی۔ زندگی جب ہمواری کے ساتھ بسر نہیں ہوتی تو سوچنے کی ضرورت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

انسانیات کے نقطہ نظر سے فلسفہ علوم کی فہرست میں سب سے آخر میں نمودار ہوا ہے کیونکہ انسان اپنی فوری ضروریات کو پہلے رفع کرنا چاہتا ہے۔ ضروریات بعیدہ پر اسکی نظر آخر میں پڑتی ہے۔ فلسفہ چونکہ انسانی نسل کی ضروریات بعیدہ سے متعلق ہے لہذا اس کا ظہور سب کے بعد ہوا ہے۔ مگر فلسفہ نام صرف استدلالوں کے اصول قایم کرنے اور تحلیل و ترکیب سے کام لینے کا نہیں وہ نام ہے سوچنے اور بات چیت کے ذریعہ نتائج کے اظہار کا بھی وہ زبان جس میں اسموں، ضمیروں، صفتوں، اور فعلوں کے درمیان تفریق کی گئی استدلال کا ایک قوی ذریعہ تھی۔ بہرحال فلسفہ قدیم ہے لیکن وہ کتنا قدیم ہے یہ بیقین نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ابتداء یونان سے نہیں ہوئی۔ کیونکہ تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ فلسطین، بابل، اشوریہ اور وادئ نیل اس کے نامور گہوارے ہیں۔ ان ممالک میں فلسفہ ہم احساسی سحر کی صورت میں رائج تھا یعنی عملی ضروریات اور خواہشات اس سے وابستہ تھیں۔ یونانی انہی ممالک کے شاگرد تھے سمپلیکس نے مصر میں داخلہ کی اجازت دیکر انھیں فلسفہ سے روشناس کرایا۔ قدیم یونانی فلاسفہ عموماً مصر و شام اور ایران و عراق کے سیاح ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے استادوں کی تعلیمات میں ایک جدت کی۔ وہ یہ کہ فلسفہ کو حتی الوسع غیر انسانی بنایا یعنی فکر جو اب تک ایک وسیلہ تھا اب مقصد بن بیٹھا۔ مشرقی فلسفہ میں یہ چیز عنقا تھی۔ نہ چین کے فلسفہ میں اسکا شائبہ ہے نہ ہند کے نہ ولایات بین النہرین کے نہ وادئ نیل کے اور نہ ارض فلسطین کے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ فلسفہ کی ابتداء یونان میں ہوئی۔ اور یہ کہ فلسفہ یکسر مغرب کی چیز ہے۔ ہندی، چینی، مصری اور ایرانی فلسفوں کی موجودگی میں ممکن ہے یہ دعویٰ بعض اصحاب کی نظروں میں مضحکہ خیز معلوم دے۔ لیکن

ایک مستقل اور بے غرضانہ علمی تفتیش کی حیثیت جو کہ یونانیوں نے فلسفہ کو دی سوائے مغرب کے اور کہیں نہیں پائی جاتی۔ مشرق میں فلسفہ عموماً مذہب کا غلام رہا ہے۔ مذہب سے علحدہ اس کا کوئی وجود نہیں۔ مسلمانوں کا یوں تو صحیح معنوں میں اپنا کوئی فلسفہ نہیں۔ مگر بقول دو بوئر وہ ایسے لوگ بھی نہ تھے جو بغیر سوچے رہ سکتے۔ تاہم جو کچھ ان کے پاس ہے وہ اثینیہ اور اسکندریہ کی بندرگاہوں سے برآمد کیا ہوا مال ہے۔ لہٰذا اصولاً عربی فلسفہ کو اگر جگہ دی جا سکتی ہے تو فلسفۂ مغرب کے تحت۔ مشرق و مغرب پر نظر ڈالنے سے یہ بات نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے کہ مشرق کی آب و ہوا مذاہب اور انبیاء کے لئے غیر معمولی طور پر موزوں واقع ہوئی ہے۔ اور مغرب کی فلسفہ و حکمیات کے لئے۔ مشرق سے انجیل اور عیسیٰ، قرآن اور محمد کی جنس مغرب کو روانہ کی گئی اور مغرب نے اس کے معاوضہ میں مشرق کو نظریات اور نظامات، توپیں اور ہوائی جہاز دئے۔ اس فرق پر محترمہ خالدہ ادیب خانم نے جامعہ ملیہ کے توسیعی خطبات میں سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔ جو "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" کے عنوان سے شایع ہو چکے ہیں۔

میں نے اوپر یہ کہا ہے کہ یونانیوں نے اپنے اُستادوں کی میراث میں اضافہ یہ کیا کہ فلسفہ کو زیادہ سے زیادہ غیر انسانی بنایا یا بنانے کی کوشش کی۔ یہ تصور حکمیاتی تصور کہلاتا ہے۔ اور حکمیات سے بالکل علحدہ چیز ہے۔ حکمیات اور مطالعۂ فطرت کی ابتداء یونانیوں سے نہیں ہوئی۔ ان کا سراغ تو ہم کو قدیم سے قدیم زمانہ میں بھی ملتا ہے۔ کیونکہ تنازع للبقاء کے لئے ان چیزوں کی ضرورت شدید تھی۔ اور ان کے بغیر تنازع للبقاء کی تکمیل ناممکنات سے تھی۔ قدیم عہد حجری کے انسان کو مادہ کے بہت سے خواص، نباتات کی بیشتر صفات، اور حیوانات کی اکثر عادات کا علم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پانی بھگوتا ہے، آگ جلاتی ہے ہوا اُڑاتی ہے، ہلکی چیزیں پانی میں تیرتی ہیں، بھاری چیزیں ڈوب جاتی ہیں، نباتات میں کون غذا ہیں اور کون زہر؟ شکار کے جانوروں کی عادات کیا ہیں اور درندوں کے اطوار کیا؟ کس جڑی بوٹی سے انسان اچھا ہو سکتا ہے اور کس سے مر سکتا ہے؟ غرض کہ اسے ہم جڑی بوٹیوں کے خواص سے واقف ہونے کے اعتبار سے طبیب، زخموں پر پتوں کے کوٹ کر باندھنے کے لحاظ سے سرجن، آگ کے جلانے کے طریقہ کا ماہر ہونے کی وجہ سے طبیعیات داں، کھانا پکانا جاننے کے باعث ماہر کیمیا، دریاؤں اور پہاڑوں کا علم رکھنے کے سبب عالم جغرافیہ، اور اُنگلیوں پر گنتی گننے کی بدولت ماہر ریاضیات قرار دے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ فطری مظاہر کے متعلق عام قوانین منضبط اور مرتب کرنے کا کام بھی یونانیوں نے انجام نہیں دیا۔ کیونکہ مصریوں کو بعض ریاضیاتی قوانین پر ان سے بہت پہلے زبردست عبور حاصل تھا۔ طالیس ملسطی نے ہندسہ کی بنا مصریوں کی مساحت زمین سے واقف ہونے کے بعد ڈالی۔ ۶۴۰ سے ۵۸۵ ق-م کو اس نے ایشیائے کوچک میں واقع ہونے والے گہن کی جو پیشین گوئی کی وہ بابلی اور کلدانی ماخذوں پر مشتمل تھی۔ ۸۰۰ ق-م میں وادئ فرات کے بڑے بڑے شہروں میں زبردست رصد گاہیں قائم تھیں جہاں راصدین مطالعۂ افلاک میں محو رہتے تھے۔ یونانی طب بھی علیٰ ہٰذا القیاس مصری مخطوطوں اور تصنیفوں کا شرمندۂ احسان ہے۔

یہ حکمیاتی تصور ہے کیا چیز؟ اس کا یہاں پر بتلا دینا ضروری ہے۔ کیونکہ اسی کی وجہ سے یونانی موجد فلسفہ قرار پائے۔ یونانیوں نے اپنے پیشروؤں کے مشاہدات اور معلومات پر کافی غور و خوض کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دنیا قابل علم ہے یعنی اس کی تحقیق و تفتیش ممکن ہے کیونکہ اس کے کام بعض قوانین کے تحت انجام پاتے ہیں اور یہ قوانین ایسے ہیں جنھیں ایک سعی مسلسل کے ذریعہ دریافت کیا جا سکتا ہے۔ اس تصور کی اہمیت سے خود یونانی پورے طور پر واقف نہ تھے طالیس پانی کو دنیا کی اصل قرار دیکر اگرچہ بظاہر ایک قیاس کو منظر عام پر لایا ہے جو چنداں اہم نہیں تاہم وہ بتلانا چاہتا ہے کہ دنیا حقیقتاً کیا ہے اور یہ ایک بہت بڑی چیز تھی۔

یوں حقیقی فلسفہ کی ابتدا یونان میں ہوئی اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ طالیس آدم فلسفہ ہے۔ یہاں تک کی بحث و تمحیص کا ماحصل یہ ہے کہ فلسفہ انسانی علم کی وہ شق ہے جس میں تخصی و نوعی مختصات کو فوری و وقتی ضروریات کو زیادہ سے زیادہ حذف کیا جاتا ہے یا حذف کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اب ایک قدم اور آگے بڑھائیے۔

فلاطون نے اپنے ایک مکالمہ میں فلسفی کی تعریف کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ وہ "اپنے عالم تصور میں پوری دنیا پر غور کرتا ہے" دنیا پر مجموعی حیثیت سے نظر کرنا فلسفہ کی دوسری بڑی خصوصیت ہے۔ لیکن ایسی نظر سے بالطبع یہ لازم آتا ہے کہ ایسے علم میں جملہ دنیوی تفصیلات بہ تمام و کمال موجود نہیں ہو سکتیں۔ برخلاف اس کے علوم مخصوصہ یعنی طبیعیات، کیمیا، فلکیات، ریاضیات، حیاتیات وغیرہ وغیرہ میں چونکہ دنیا کے صرف ایک پہلو سے بحث کی جاتی ہے لہذا تفصیلات اور جزئیات کی دولت سے ان کا دامن مالامال ہے۔ یوں انسانی علم کی قسمیں دو ہیں (۱) فلسفہ اور (۲) سائنس۔ سائنس میں دنیا کے کسی ایک پہلو کے متعلق تفصیلی علم حاصل کیا جاتا ہے۔ اس طرح سائنس داں ایک صدا بند کمرہ میں عزلت گزیں ہو کر یہ پتہ لگاتا ہے کہ دنیا کے اس حصہ کے بارے میں جو اس کا منتہائے نظر ہے زیادہ تفصیل اور صحت اور تعین کے ساتھ کون کونسی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ اسے یہ پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کے نتائج کیا ہیں، ان سے کون کون سے نقصانات یا فوائد پہونچ سکتے ہیں۔ پھر اسے یہ بھی پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کے نتائج اور صدا بند کمروں میں بیٹھ کر داد تحقیق دینے والے سائنس دانوں کے نتائج سے میل بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ اسے ان امور پر غور کرنا چاہئے اور نہ وہ غور کرتا ہے۔ لہذا ایک ایسے علم کی ضرورت ہے جو مختلف سائنسوں کے نتائج میں ربط اور یکسانیت پیدا کرے۔ یہ کام فلسفہ کا ہے۔ لیکن اس فریضہ کی انجام دہی میں سائنسوں کی تفصیلات سے اعتناء نہیں کیا جاتا بلکہ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ کن نتائج کو پہونچی ہیں لیکن فلسفہ علوم کا صرف تکملہ ہی نہیں بلکہ مقدمہ بھی ہے سائنسداں جن معطیات سے ابتداء کرتا ہے ان کے متعلق بلا دلیل یہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ اس کے ذہن سے بے نیاز موجود ہیں گویا علوم صحیحہ کے بازار میں غیر منقح مفروضات کے سکّے چلا کرتے ہیں۔ اب یہ فریضہ فلسفہ کا ہے کہ وہ جعلی اور کھرے سکّوں میں تمیز کرے۔ یوں فلسفۂ علوم کا دیباچہ بھی ہے اور خاتمۂ کلام بھی۔

اس میں شک نہیں کہ سائنس بھی انہی مسائل سے بحث کرسکتی ہے جن مسائل سے کہ فلسفہ بحث کرتا ہے۔ کیونکہ علم کا بقول رسل کوئی دروازہ ایسا نہیں جو فلسفہ کے لئے کھلا اور سائنس کے لئے بند ہو، لیکن سائنس داں کا ایسی صورت میں سائنس داں سے بڑھ کر کچھ اور ہونا لازم ہو جاتا ہے اور یہ کچھ اور ہونا فلسفی ہونا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ فلسفہ کائنات کے متعلق ایک جامع و مانع نظریہ ترتیب دیتا ہے ایسے نظریہ کے لئے جہاں علوم صحیحہ کے حاصل شدہ نتائج کی ضرورت ہے وہیں بعض ایسی چیزیں بھی درکار ہیں جو علوم صحیحہ کے دائرہ سے باہر ہیں مثلاً تاریخ، سوانح عمریاں، فنون لطیفہ، اور عام اخلاقی و مذہبی عواطف وغیرہ۔

یہی وجہ ہے کہ فلاسفہ جامع العلوم عقلا ہوا کرتے تھے اور ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کانٹ کے بعد کے زمانہ میں فلسفہ کی یہ خصوصیت کچھ معرض خطر میں پڑ گئی تھی لیکن بیسویں صدی میں وہ پھر سے بحال ہو گئی ہے۔

میں نے اوپر یہ بتلایا ہے کہ فلسفہ کے معنی سوچنے کے ہیں اس سلسلہ میں ایک بات یہ بتانی ضروری ہے کہ ہر سوچنے والا انسان فلسفی نہیں ہوتا۔ یہاں اگر میں اے۔ یس۔ راپوپورٹ کی ایک مثال نقل کردوں تو میرا مافی الضمیر پوری طرح واضح ہو جائے گا۔ وہ کہتا ہے کہ "ایک متوسط درجہ کا ذی فکر انسان جو حسی مسرتوں کا شکار یا مادی لذتوں میں مبتلا نہ ہو ایک حد تک فلسفیانہ نظر سے کام لیتا ہے اور کم و بیش ایک فلسفی ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص کبھی کبھی اپنی بگڑی ہوئی گھڑی کو درست کر لیا کرے تو ہم اس کو گھڑی ساز نہیں کہہ سکتے، اسی طرح ایک ایسے شخص پر بھی فلسفی کا اطلاق نہیں ہوسکتا جو کبھی کبھی سوچتا، تحقیق و تدقیق کرتا، اور اشیاء کے متعلق نہ صرف چند ذاتی خیالات رکھتا ہو بلکہ انھیں یقینی بھی جانتا ہو" تو پھر فلسفی کون ہوسکتا ہے، یہ ایک سوال ہے۔ اس کا جواب فیثا غورث کے لفظوں میں یہ ہے کہ فلسفی وہ ہے جس نے "مطالعۂ قدرت اور انکشاف راز ہستی کو اپنا مقصود حیات قرار دے لیا ہے" گویا ہم فلسفی اسکو کہیں گے جس نے اپنی عمر اشیاء اور تصورات کی ماہیت خیر، جمال اور حق کی تحقیق کے لئے وقف کردی ہے۔ ایسا شخص لازماً اس شخص کے مقابلہ میں زیادہ وسیع معلومات رکھے گا جو کبھی کبھی غور کرتا ہے۔

فلسفہ کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں:۔

(۱) تجربہ (۲) عقل (۳) وجدان اور (۴) ضمیر۔ سائنس بھی چونکہ عقل اور تجربہ کی رہنمائی میں کام کرتی ہے لہذا اس کو اور فلسفہ دونوں کو مجموعاً عقلیات کہا جاتا ہے۔ لیکن اس سے یہ قیاس نہیں کرنا چاہئے کہ وہ دونوں ایک ہیں سائنس زیادہ تر ٹھوس فائدے ہم پہونچاتی ہے وہ ہوائی جہاز اور ریڈیو کے ذریعہ انسانی آسائشوں میں اضافہ کرتی ہے لیکن فلسفہ سے ایسا کوئی ٹھوس فائدہ متصور نہیں۔ اس کے علاوہ ادب اور فنون لطیفہ سے ہماری روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ برعکس اس کے فلسفہ اپنی پشت پر ایک بے پناہ خشکی کو لئے ہوئے ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ فلسفہ جواری کی امیدوں کی طرح لاحاصل اور ساہوکار کے دماغ کی طرح خشک ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہ بے سود

اور بے ضرر کاوشوں کے مجموعہ کا نام فلسفہ ہے۔ یہ الزام غیر فلسفیانہ طبقوں میں کتنا ہی وزنی اور مقبول کیوں نہ ہو حقیقت میں ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ وہ غلط فہمی یہ ہے کہ فلسفہ ہماری اغراض قریبہ سے نہیں بعیدہ سے تعلق رکھتا ہے۔ پیٹ میں جب تک دو لقمے نہ ہوں تب تک عشق اور فلسفہ کی بہت کم سوجھتی ہے۔ جب معاش کی طرف سے اطمینان ہو جاتا ہے تو انسان کی نظر غذائے روحانی پر پڑتی ہے کیونکہ بقول رسل "افلاس اور امراض کا تا بہ حد امکان ازالہ ہو چکا ہوتا تب بھی ایک قابل لحاظ مدنیت کے پیدا ہونے میں بہت سے اور مراحل باقی ہوتے" اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ مراحل روحانی نہیں یا یہ کہ ان کو قطع کرنے کے لئے فلسفہ کا رہبر درکار نہیں۔

فلسفہ اور سائنس کے تعلقات ہمارے زمانہ میں بہت خوشگوار ہیں۔ رسل، ڈریش، وہائٹ ہیڈ، الیگزینڈر، ایڈنگٹن، اسمٹس، برگسان، جینس، لائڈ مارگن، ریڈ، نارتھراپ وغیرہ جیسے لوگوں کی مساعی سے یہ تعلقات اور خوشگوار تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اور اس کی ضرورت بھی ہے۔ سائنس سے الگ ہو کر فلسفہ شاعری یعنی بے قید تخیل سے زیادہ نہیں رہتا علیٰ ہذا فلسفہ سے بے نیاز ہو کر سائنس ایک ایسا مجموعہ بن جاتی ہے جس میں ترتیب، ربط، اور نظم نام کو نہیں۔ فلسفہ کا ہر قدم سائنس کے لئے اور سائنس کا ہر قدم فلسفہ کے لئے ایک تقویت بخش دوا کا حکم رکھتا ہے۔

فلسفہ اور سائنس چونکہ انسان کی عقل سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کو مذہب والے عموماً اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ فلسفہ کے متعلق ایک کہاوت ہے کہ فلسفی شیطان کا چرخہ ہے اور فلسفہ اس کا سوت۔ لیکن یہ نرا تعصب ہے سائنس حکمیاتی قوانین کے ذریعہ واقعات کی گٹھریاں بناتی ہے۔ اور فلسفہ ان قوانین کو ملاتا اور ان پر تنقیدی نظر ڈالتا ہے۔ گویا دونوں عقل کی مشعل سے اپنا راستہ ٹٹولتے ہیں۔ مذہب کا تعلق عقل سے نہیں جذبات سے ہے۔ وہ سراسر ایک جمالی چیز ہے۔ اب اس میں ایک عنصر منطقی جو پایا جاتا ہے اس کی حیثیت عقلی توجیہ کی ہے یعنی ہم اپنے عقائد کی تائید میں دلایل وضع کرتے ہیں نہ کہ دلایل کی وجہ سے عقاید کی تائید کرتے ہیں۔ لیکن اس چیز کا ہمیں شعور نہیں ہوتا۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ مانتے ہیں بر بناء عقل مانتے ہیں اسی لئے جب فلسفہ ایسے نظریات ترتیب دیتا ہے جو مذہب کے نقطۂ نظر سے ناپسندیدہ یا ناگوار ہوتے ہیں تو فوراً محراب و منبر سے صدائے احتجاج بلند ہوتی ہے کہا جاتا ہے کہ فلسفہ الحاد کی طرف منجر ہے۔ حالانکہ فلسفہ نہ مذہب کا دوست ہے اور نہ دشمن۔ نہ وہ مذہبی حقایق کو بہ دلایل غلط ثابت کر سکتا ہے اور نہ یہ کہ انہیں صحیح منوا سکتا ہے۔ مذہب اور فلسفہ دونوں کی راہیں مختلف ہیں اور مختلف بھی اتنی کہ کسی جگہ متقاطع ہونے کی کوئی توقع نہیں۔ اکبر الہ آبادی کے بیشتر اعتراضات اسی غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ کلام یعنی الٰہیات کو فلسفہ سے کوئی تعلق نہیں وہ مذہب کی تائید عقلی دلایل سے کرتی ہے اس لئے وہ بھی اسی سوء فہمی کی پیداوار ہے۔[1]

---

[1] پروفیسر باری ندوی نے مذہب و عقلیات میں اور پروفیسر وہاٹ ہیم نے نفسیات مذہب میں اس نقطۂ نظر کی قابلیت سے حمایت کی ہے۔

فلسفہ کے خلاف صرف یہی ایک اعتراض نہیں اور بھی کئی اعتراضات ہیں۔ بعض تو باقاعدہ دشمن ہیں۔ اور بعض بے قاعدہ۔ بے قاعدہ دشمن فلسفہ کا مضحکہ اُڑاتے ہیں فلسفہ چونکہ معمولی معمولی چیزوں پر شک کرتا ہے اور معمولی چیزوں پر یا تو فلسفی شک کرتا ہے یا بے وقوف۔ اس لئے فلسفہ کے بے قاعدہ دشمن فلسفی اور بے وقوف میں کوئی تمیز نہیں کرتے۔ وہ فلسفی یا بیوقوف کے الفاظ کو مترادف سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ارسٹوفین اور مولیئر اسی قسم کے بے قاعدہ دشمنوں سے ہیں۔ اول الذکر نے "بادل" نامی تمثیل میں اور موخر الذکر نے "نکاح بالجبر" نامی ڈرامہ میں فلسفیوں کو دل کھول کر برا بھلا کہا ہے[1]۔ لیکن یہ بے قاعدہ دشمن اتنے خطرناک نہیں جتنے کہ باقاعدہ دشمن خطرناک ہیں۔

ان باقاعدہ دشمنوں میں کئی قسم کے لوگ شامل ہیں۔ بعض جو کنارِ آب رکناباد و گلگشتِ مصلّٰی کے شیدائی ہیں وہ معمۂ کائنات کی بلندی اور انسانی ذہن کی پستی کو دیکھ کر یہ مشورہ دیتے ہیں کہ:-

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

اور بعض جو یہ جانتے ہیں کہ انسان "شجرِ ممنوعہ" کا بے حد شائق واقع ہوا ہے، وہ فلسفہ کے اُلجھے ہوئے استدلال کو ہدفِ ملامت بناتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ

فلسفی سرِ حقیقت نتوانست کشود
گشت رازے دگر آں راز کہ افشا می کرد

مگر رہرو راہ فلسفہ جانتا ہے کہ ہر وادی وادیٔ ایمن نہیں ہوتی اس لئے سفرِ عشق میں نازک مزاجی حرام ہے۔ مشکلیں جتنی بڑھتی ہیں اتنی ہی عزم میں اُستواری پیدا ہوتی ہے یہ انسانی فطرت ہے۔ چنانچہ اس قسم کے اعتراضات پر کبھی سنجیدگی سے کسی نے غور نہیں کیا۔ البتہ جب کہا گیا کہ "ہم کو ضرورت صرف مظاہر کے مشاہدہ کی ہے ان کی تعبیر درکار نہیں" (ایجابیت) تو لوگ بے شک چونکنے ہوئے۔ اب چور دروازہ کی راہ ایک شک خود طالبانِ فلسفہ کے دماغ میں گھسا انھوں نے سوچا کہ واقعی فلسفہ نے ڈھائی ہزار سال کے عرصہ میں کچھ حاصل نہیں کیا نہ اس کا مقصد متعین ہوا نہ منہاج اس پر ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا "فلسفہ مُردہ باد!"۔

ان کے بعد بعض اصحاب اور ایسے نمودار ہوئے جنھوں نے کہا کہ فلاسفہ کا کوئی مذہب ہو یا نہ ہو وہ ایک مکمل نظام ضرور

---

[1] فلسفہ کی طرف سے بدظنی آج دنیا میں بے حد عام ہے۔ فلسفی کو اس بڈھے گدھے سے تشبیہ دیجاتی ہے جو ایک سرسبز جنگل اور شاداب موسم میں ایک ٹُنڈ مُنڈ درخت پر آنکھیں بند کئے بیٹھا ہے۔ قاضی عبدالغفار بھی کبھی کبھار گرمیٔ گفتار کے اظہار کے لئے فلسفہ پر فقرے کس جاتے ہیں مگر وہ یہ بھول رہے ہیں کہ شوخ نگاری لیلیٰ کے خطوط اور مراسے کے کالموں ہی میں بھلی لگتی ہے یعنی اس دائرہ کے باہر اسکی حیثیت "گینڈے کی کلیل" سے زیادہ نہیں۔

ترتیب دیتے ہیں۔ اور اس نظام کو دنیا پر منطبق کرتے ہیں لیکن نظام تو فلسفی کے ذہن سے باہر کوئی حقیقت نہیں رکھتا اس کا اطلاق کسی پر نہیں ہوتا۔ اگر مظاہر کا مشاہدہ کیا جائے اگر ان میں ترتیب اور ربط پیدا کیا جائے، اگر ان سے ضوابط اخذ کئے جائیں تو یہ ضوابط نہ صرف مظاہر پر منطبق ہوں گے بلکہ ان مظاہر کی طرح اور مظاہر کی پیش بینی کو بھی ممکن بنائیں گے۔ لیکن اگر آپ اپنے صوفہ میں اطمینان سے دراز ہوں۔ لطیف اور خوشبودار سگریٹ سے شغل کر رہے ہوں اور سائنسوں کے نتائج کی موجودگی میں کائنات کی ماہیت پر غور فرما رہے ہوں تو آپ کے نتائج صرف ایک ماہر نفسیات کے لئے دلچسپ ہو سکتے ہیں وہ حقیقت کے متعلق تو کچھ نہیں کہتے البتہ آپ کے متعلق بہت کچھ کہتے ہیں۔ یہ اعتراض آلڈوس ہکسلے وغیرہ کا ہے۔

ان کے بعد ایک ٹکڑی اور آئی۔ اس نے کہا کہ فلسفہ کے تھیلے میں حقیقی فلسفیوں کی بام مچھلیاں اور زبردستی کے فلسفیوں کے سانپ اتنے ملے جلے ہوئے ہیں کہ ایک شخص کے لئے ان میں تمیز کرنا سخت دشوار ہے۔

ان کے بعد ایک طبقہ سے یہ بھی ندا اٹھی کہ قوم کے بچوں کو تعلیم صرف ان علوم کی دیجانی چاہئے جو کسب معاش اور تنازع للبقا میں مفید ہوں نظری ریاضیات، تاریخ، فلسفہ، السنۂ قدیمہ وغیرہ کی تعلیم ہمارے تنور شکم کے لئے روٹی کا ایندھن مہیا نہیں کر سکتی۔ تعلیم کا مقصد پیٹ پالنا ہے اور بس۔

یہ اعتراضات میرے خیال میں اہم ترین اعتراضات ہیں۔ اور فلسفہ میں جو شخص بھی قلم اٹھائے وہ ان سے اعراض یا اغماض نہیں برت سکتا۔ پس مجھے بھی اپنی سکت بھر کوشش کرنی چاہئے۔

(باقی) **مرزا محبوب بیگ**

"نگار" کے پُرانے پرچے

نگار کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کرلیں قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:۔

(سنہ ۲۲ء) ستمبر ۴ر۔ (سنہ ۲۶ء) جنوری۔ جون۔ نومبر ۵ر فی پرچہ۔ (سنہ ۲۷ء) اپریل۔ مئی و جون ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۲۹ء) دسمبر ۵ر۔ (سنہ ۳۰ء) مئی ۴ر۔ نومبر ۵ر۔ (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ (سنہ ۳۲ء) فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل) ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۳ء) فروری۔ جولائی و اکتوبر ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۴ء) مارچ ۴ر، (سنہ ۳۵ء) نومبر ۵ر۔ (سنہ ۳۶ء) فروری۔ مارچ۔ اپریل۔ جون۔ جولائی۔ اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۵ر فی پرچہ (سنہ ۳۷ء) مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔ اکتوبر نومبر و دسمبر ۸ر فی پرچہ۔

منیجر نگار

حب وطن

جنوری کا مہینہ تھا آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور کہیں کہیں برف باری ہو جانے کی وجہ پارہ بہت نیچے درجے تک پہونچ گیا تھا، گاؤں کی کچی اور ناہموار سڑک پر کئی آدمی ایک جنازہ لئے جا رہے تھے جس پر ایک سفید چادر پڑی تھی

جنازے کے ہمراہ ایک نوجوان تھا اُس کی عمر کوئی پچیس سال کی ہوگی وہ ایک رکشا کھینچ رہا تھا اُس میں دو کمسن بچے بیٹھے تھے اُن کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور بدن ایک موٹے کمبل سے لپٹا ہوا تھا

یہ جنازہ اُن کی ماں کا تھا اور جو رکشا کھینچ رہا تھا وہ اُن کا باپ تھا، رات کو جب اُن کی آنکھ کھُلی تو دیکھا کہ اُن کا مختصر مکان لوگوں سے بھرا ہے ماں کی قوت گویائی سلب ہو چکی ہے اور باپ اُس کا ہاتھ پکڑے بستر پر بیٹھا رو رہا ہے

بعد ازاں باپ نے بغیر کچھ کہے بچوں کے رخسار چومے اور اُن کو رکشے میں بیٹھا لیا اُنھوں نے سوچا کہ وہ حسب سابق سیر کے لئے جا رہے ہیں لیکن اور دنوں کی طرح باپ کے چہرے پر تازگی نہ تھی وہ خاموشی سے نیچی نظریں کئے رکشا کھینچ رہا ہے یہ منظر دیکھ کر اُن کا دل بھر آیا

چلتے چلتے وہ لوگ گاؤں کے باہر پہونچ گئے اب اندھیرا ہو چلا تھا اور اُن کو نیند آ رہی تھی

اُنھوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا وہ ایک مندر میں چٹائی پر لیٹے ہیں، پھر رکشا میں بیٹھ کر وہ گھر لوٹ آئے ——

آہا گھر —— ! لیکن ماں کہاں ہے چھوٹا بچہ ماں کو نہ پاکر رونے لگا سورج کی کرنیں کمرے میں چمک رہی تھیں کھڑکی کے پاس باپ کھڑا تھا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے

(۲)

فروری کا اختتام تھا آسمان صاف اور ہوا بڑی خوشگوار چل رہی تھی برآمدے کے سامنے والے مختصر باغ میں رنگ برنگ کے پھول کھلے تھے اور اُن کی مہک اطراف میں پھیل رہی تھی

رکشا اسٹینڈ پر چمکتی ہوئی گاڑیاں ایک قطار میں کھڑی تھیں، رکشا کھینچنے والے پاس بیٹھے تمباکو پی رہے تھے اور

گپ بازی میں مشغول تھے کہ ناگہاں دور سے گھنٹے کی آواز آئی اور ایک شخص "خبر!" "خبر!" چلاتا دوڑا ہوا آیا سب دیوانہ وار "خبر" خریدنے کے لئے ٹوٹ پڑے۔ دو دو پیسے میں سب نے ایک کاغذ خرید لیا سڑک پر اچھی خاصی بھیڑ ہو گئی

اعلان کیا گیا کہ سب کو لڑائی پر جانا ہوگا صرف بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا، مریض اور عورتیں جنگ میں شریک نہیں ہو سکتیں اُن کے سوا ہر ایک کو جنگ میں حصہ لینا ہوگا، اُس کے زیر غور اب یہ سوال تھا کہ اُس کے معصوم بچوں کی نگہداشت کون کریگا اگر وہ ان معصوموں کو کسی کے سپرد کردے تو کیا وہ بیفکری سے جنگ میں شریک ہو سکتا ہے

وہ تمام دن کوچہ بہ کوچہ در بدر ٹھوکریں کھاتا پھرا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا کسی نے بچوں کی کفالت منظور نہ کی دوسرے دن چھوٹے بچے کو پیٹھ پر باندھ کر اور بڑے دو بچوں کو رکشا میں بیٹھا کر وہ سڑک پر اس نیت سے گھومنے لگا کہ آج وہ اپنے بچے ہمیشہ کے لئے کسی کو دیدیگا، لیکن کون لے؟ سب کو اپنی اپنی پڑی تھی کسی نے اُس کی امداد نہ کی

(۳)

اُسے فوج میں اپنا نام لکھوانا ہوگا ورنہ قید سخت کی سزا بھگتنی پڑے گی یا مجمع عام میں کتے بلی کی طرح بندوق سے مار دیا جائے گا کتنی شرم اور ذلت کی بات ہے یہ سوچکر وہ لرز گیا

پھر وہ آہستہ بستر سے اُٹھا تینوں بچے سو رہے تھے لمپ کی روشنی اتنی مدھم تھی کہ اُسے اپنے بچوں کے چہرے صاف نظر نہ آتے تھے تاہم اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ بڑا چھرا کہاں ہے۔

ہاں وہ چھرا ـــــ اُس کا بچپن کا ساتھی جس سے اُس نے کتنے ہی جنگل صاف کئے تھے کتنے ہی چوروں کی جانیں لی تھیں، اٹاچیچی نے اُس کی دھار دیکھی ہنوز دھار خراب نہ ہوئی تھی لیکن کسی کسی جگہ زنگ لگ گیا تھا تھوڑا اور تیز کرلیں ٹھیک ہوگا، چنانچہ اُس نے ہتھیار تیز کرنے کا پتھر اُٹھایا

پتھر پر چھرا گھسا جانے لگا اُس نے لمپ کی مدھم روشنی میں ایک بار بچوں کے چہرے کی طرف دیکھا کتنی گہری نیند تھی ـــــ صرف سانس لینے کی آواز آرہی تھی

دور مندر کے گھنٹے نے بارہ بجائے کتنی خوفناک آواز تھی ایک بچے نے کروٹ لی اُس کا ہاتھ کمبل سے باہر ہو گیا باپ بچوں کے سرہانے بیٹھا تھا کہ یکایک لمپ گل ہو گیا

تاریکی ـــــ خوفناک تاریکی ایسی تاریکی جہاں بینائی کچھ کام نہ کر سکے، پہلے چھوٹے بچے کو ـــــ! بالفرض وہ جاگ جائے اور چلا اُٹھے تو اُس کی آواز سے دونوں بچے بیدار ہو سکتے ہیں پھر یہ ظالم محبت مرے ارادے میں مجھے کامیاب نہ ہونے دے گی

آہ کتنی چھوٹی گردن ہے ـــــ کتنی نازک! لیکن مجھے علم ہے کہ کس جگہ ضرب لگانے سے مرے معصوم

کو زیادہ تکلیف نہ ہوگی

پھر منجھلے کو ------ بعجلت ------ ! ابھی ہاتھوں میں قوت ہے بڑا جاگ اُٹھا کیا ؟ نہیں تو وہ چین سے سو رہا ہے اور یہی مری مرنے والی کی آخری یادگار ہے ابھی کی بات ہے وہ نام رکھائی کے دن بچے کو اُس کی ماں کی گود میں دیکر مندر میں گیا تھا وہاں اُس کے بازو پر ایک تعویذ باندھا گیا تھا کہ وہ نیکنام اور خوش بخت ہو لیکن ------ آج ------ ؟ آہ ------ !

اُس کا ہاتھ کانپ گیا پیشانی سے پسینے کی بوند ٹپک کر چھرے کے قبضہ پر گری چھرا ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا، کیا یہ ہاتھ اپنا کام انجام نہیں دیسکے گا اتنا کمزور ہے، ہرگز نہیں !

قربانی ختم ہوئی اُس نے لاشوں کو کمبل میں لپیٹ کر رکشا میں رکھا پھر رکشا کھینچکر سڑک پر آیا

کچھ دن پہلے وہ اسی راہ سے گزرا تھا اُس روز اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن آج اُس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے اُس روز اپنا کہنے کے لایق سب کچھ تھا ------ لیکن آج کچھ بھی نہیں صرف اپنا وطن ہے ------ اور اُس کی محبت

اُس وقت رات کا پچھلا پہر تھا پہاڑوں میں ڈوبتے ہوئے چاند کی مدہم روشنی میں اُس نے تینوں بچوں کو اُنکی ماں کی پائنتی مٹی میں سلا دیا اور پھر اُن کی قبروں پر تاڑ کے چھوٹے پودے لگا دئے

بچے کتنے آرام سے سو رہے ہوں گے کاش اُسے بھی اُن کے قریب جگہ مل سکتی لیکن اُس کے لئے تو جنگ کے خوفناک دیو نے منہ پھیلا رکھا ہے وہاں اُسے آرام ملے گا یہاں اُس کے لئے جگہ نہیں چلو ٹاکیچی ------ چلو یہاں نہیں

اُس نے گھٹنے ٹیک کر ایک بار پرماتما کی یاد کی

(۴)

اُسوقت پو پھٹ رہی تھی جب وہ مندر میں داخل ہوا زینے کے نیچے پتھر کے ایک حوض میں پانی بھرا تھا دیوتا کے درشن کرکے گنہگار اُس پانی سے اپنے گناہ دھو ڈالتے ہیں چنانچہ اُس نے بھی اس پانی سے اپنے ہاتھ دھو ڈالے ہاتھ دھو کر پوجاری کے پاس آ کھڑا ہوا پھر کامل واقعات مفصل بیان کر دئے اور کہا کہ "اس دنیا میں میرے سر کسی کی ذمہ داری نہیں ہے، اب میں اطمینان سے وطن کے لئے جان دوں گا مندر کے دوار پر میرا ایک رکشا رکھا ہے اُسے بھی آپ لے لیجئے اب میں فقیر ہوں"

یہ کہہ کر وہ مندر سے سر جھکائے نکل گیا

(۵)

مارچ کا مہینہ تھا سارا گاؤں جنگ پر جانے کو تیار تھا دس ہزار جھنڈوں پر سورج کی کرنیں چمک رہی تھیں،

سڑک پر بھی کثیر ہجوم تھا لیکن قلعے کے پھاٹک کے سامنے اور زیادہ ہجوم تھا
بگل بجا سپاہیوں کے نام پکارے جانے لگے

"ٹاکیچی حاضر ہے ؟"

"حاضر ہے ——"

مسرت اور غرور کے نشے میں سرشار فوج نعرے لگاتی نکل گئی لیکن سب سے زیادہ خوشی ٹاکیچی کو تھی

خونی —— ؟ ہاں دوسروں کی نظروں میں وہ خونی ہو سکتا ہے لیکن وہ اپنے ہم وطنوں کی نظروں میں اپنے وطن کے لئے سب کچھ قربان کر دینے والا سپاہی ہے حتیٰ کہ اپنا کہنے کے لائق اُس نے کچھ رکھا نہیں۔

دور پہاڑ کے دامن میں تاڑ کے درخت کے نیچے جہاں چند مٹے ہوئے قبروں کے نشان ہیں ایک پوجاری رہتا ہے وہ تعویذ دیتا ہے جن کو بازو پر باندھنے سے وطن کی محبت دل میں بڑھ جاتی ہے

وہ تعویذ اپنے ہاتھ سے بناتا ہے جو ایک روپہلے دھاگے میں لپٹے ہوئے چند خون لگے کمبل کے ٹکڑے ہوتے ہیں —— !

(چینی افسانہ)

تقی علی یاسمی

نگار کے خاص نمبر

نگار اپنی علمی - ادبی و تنقیدی خصوصیات و ندرت کے لحاظ سے تمام رسائل میں جو ممتاز حیثیت رکھتا ہے اُس سے قطع نظر اُسکے خاص نمبر جو صرف ایک موضوع پر شایع ہوتے ہیں اسقدر جامع اور مکمل ہوتے ہیں کہ اپنے بعد اُس موضوع پر دوسری کتاب کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتے ہیں - دفتر میں مندرجۂ ذیل خاص نمبر بہت کم تعداد میں رہ گئے ہیں - اگر اب تک آپ نے انکا مطالعہ نہیں کیا تو اب طلب فرمایئے -

جنوری ۳۲ء **(غالب نمبر)** یعنی غالب کا اُردو و فارسی نظم و نثر کا وہ کلام اور لطائف جو کسی نہ کسی نہج سے اُسکی شوخ نگاری و بذلہ سنجی کے آئینہ دار ہیں جو لوگ مرزا غالب کو صرف یاس پسند شاعر کہتے ہیں وہ دیکھیں کہ غالب شوخ نگاری میں بھی اپنے زمانہ میں سب پر غالب رہا - اس میں مرزا غالب کی سہ رنگی تصویر بھی شامل ہے - اصل قیمت عہ ر - رعایتی ۱۲ ر

جنوری ۳۵ء **(اُردو شاعری)** اُردو شاعری کی تاریخ اور اُسکی عہد بہ عہد ترقی پر زبردست تبصرہ - ہر زمانہ کے مشاہیر شعراء کا انتخاب کلام - اس رسالہ کو دیکھنے کے بعد آپ کو اُردو شاعری پر کسی کتاب اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہیگی - قیمت عا ر علاوہ محصول -

جنوری ۳۶ء **(ہندی شاعری)** ہندی شاعری کی تاریخ اُسکے تمام ادوار پر تبصرہ اور ہندی کے مشہور شعراء کا انتخاب کلام مع ترجمہ ۲ بج ہر قیمت علاوہ محصول بجر - جنوری ۳۳ء **(امامت و خلافت - ڈرامہ اصحاب کہف نمبر)** مسئلہ امامت و خلافت ایک آزاد خیال شیعی کے قلم سے اور ڈرامہ مولانا نیاز کے قلم سے - قیمت علاوہ محصول عہ

مینیجر نگار

حالی کا مرتبہ اُردو ادب میں

مجنوں گورکھپوری کی تقریر جو یکم جنوری ۳۸ء کو دہلی سے نشر کی گئی

تاریخ ادب میں حالی کی تین حیثیتیں ہیں۔ سب سے پہلے تو وہ شاعر تھے۔ اور غزل کے شاعر۔ میں یہ کچھ صرف اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ ان کے کلیات کا ایک خاصا جزو غزلیات پر مشتمل ہے۔ بلکہ اس لئے کہ ایک مخصوص قسم کا تغزل انکی فطرت کا ایک اہم عنصر تھا۔ اور یہ عنصر جیسا کہ میں ابھی واضح کرنے کی کوشش کروں گا غیر شعوری طور پر اسوقت بھی اپنا کام کرتا رہا جبکہ حالی کا دل پُرانی شاعری سے سیر ہو چکا تھا۔ اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے ان کو شرم آنے لگی تھی

حالی کے کلام کا مطالعہ کرنے والے کو سب سے پہلے جس بات کا احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کا کوئی شعر حال سے خالی نہیں ہوتا۔ حالی کے یہاں نہ کہیں زبردستی کی پرواز تخیل ہے نہ خواہ مخواہ کے تشبیہات و استعارات۔ جو بات ہے "دو اور دو چار" کی طرح سیدھی مگر عالمگیر حقیقت ، یہی وجہ ہے کہ ان کی کہی ہوئی بات کو ہر شخص اپنے دل کی بات کی طرح مانوس پاتا ہے۔ چند اشعار سنئے :-

دنیا کے خرخشوں سے چیخ اُٹھے تھے ہم اول   آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت   پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
گھٹ گئیں کچھ تلخیاں ایام کی   بڑھ گئی ہے یا شکیبائی بہت
آرہی ہے چاہِ یوسف سے صدا   دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اُجاڑ   ہو گئی اک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق   رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں ؟

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور　　عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں؟

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بُلبُل　　کل نہ پہچان سکے گی گُلِ تر کی صورت

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید　　خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا
بارہا دیکھ چکے تیرے فریب اے دُنیا　　ہم سے اب جان کے دھوکا نہیں کھایا جاتا

بے قراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ　　اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

رنجش و التفات و ناز و نیاز　　ہم نے دیکھے بہت نشیب و فراز

کر دیا خوگرِ جفا تو نے　　خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے

اب وہ اگلا سا التفات نہیں　　جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں
کوئی دلسوز ہو تو کیجے بیاں　　سرسری دل کی واردات نہیں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں　　مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
نیا ہے لیجئے جب نام اُس کا　　بہت وسعت ہے میری داستاں میں
بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر　　ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ہوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے　　ہنر کی عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام　　کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا　　کچھ کر لو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں

ان اشعار سے ہم پر یہ بھی اثر ہوتا ہے کہ حالی اپنے کو ہمیشہ سئے دئے رہنے والے آدمی تھے۔ ان کی شاعری غیر معمولی

ضبط و خودداری کا پتہ دیتی ہے - ان کے نالے رُکتے ہوئے اور ان کی فریادیں تھمتی ہوئی ہوتی ہیں - ان کو جو چیز دوسرے اُردو شاعروں سے ہمیشہ ممتاز رکھے گی وہ عقل و جذبات کے درمیان ایک توازن ہے - اگر حالی "مسدس" لکھنے سے پہلے ہی مر گئے ہوتے اور صرف غزلیات چھوڑ جاتے تو آج یہی توازن ان کا سب سے بڑا اکتساب اور اُردو شاعری میں سب سے زیادہ قابل قدر اضافہ ہوتا۔ اسی توازن کا نتیجہ ہے کہ وہ غزلیں ہوں یا "مسدس" یا کچھ اور حالی کے کلام میں جوش نہیں ہوتا تاثیر ہوتی ہے

حالی نے ایک جگہ اعتراف کیا ہے کہ وہ شاگرد تو مرزا غالب کے تھے لیکن تقلید میر کی کرتے رہے اور مستفیض شیفتہ سے ہوتے رہے اور اس میں شک نہیں کہ ان کی شاعری میں یہ تینوں اثرات نہایت خوبصورت اور مکمل آہنگ کے ساتھ نظر آتے ہیں - ان کے یہاں خستگی اور گھلاوٹ میر کی ہے - ظرافت اور تمکنت کے تیور غالب کے ہیں - شائستہ عمومیت اور مہذب سادگی شیفتہ کی ہے - غالب کے شاگرد کو غالب کی پیچیدہ خیالی اور مشکل گوئی سے جس چیز نے بچالیا وہ یقیناً شیفتہ کی صحبت کا فیض تھا

حالی کئی لحاظ سے ہم کو انگریزی کے دو مشہور شاعر گرے (Gray) اور کالنس (Collins) کی یاد دلاتے ہیں جو انگریزی ادب میں رومانی تحریک (Romantic movement) کے پیش رو سمجھے جاتے ہیں - جب ہم حالی کی غزلیات پڑھتے ہیں تو ہم کو وہ کالنس سے کافی قریب نظر آتے ہیں - اپنے وقت کی غزلگوئی کے رسوم و قیود سے بغیر کسی قسم کی بغاوت کئے ہوئے غزل کو حالی نے گویا از سر نو پیدا کیا ہے - اور ان میں نئی کیفیتیں بھر دی ہیں اسکے علاوہ ان کے اشعار میں جو مخلصانہ سادگی و نرمی اور سنبھلی ہوئی غمگینی پائی جاتی ہے وہ بھی کالنس ہی کی یاد تازہ کرتی ہے - گرے کی خصوصیت حالی میں یہ ہے کہ وہ اپنے راز کو کبھی اچھی طرح افشا نہیں کرتے - بس زیر لب کچھ کہہ کر رہ جاتے ہیں - گرے کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ وہ کبھی کوئی بات کھل کر نہیں کہتا تھا - جہاں تک اسلوب کی بے ساختگی اور زبان و دل کی یک جہتی کا تعلق ہے حالی ورڈسورتھ سے بھی بہت قریب قریب کی مشابہت رکھتے ہیں - یہ سچ ہے کہ ان کے کلام میں اُس عارفانہ اداسی اور مفکرانہ گداز کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی جو ورڈسورتھ کی امتیازی خصوصیت ہے - لیکن اُردو شاعری کو انھوں نے وہی پرخلوص سادگی، وہی پرتاثیر بیرنگی اور وہی دھیمی موسیقیت دی جو ورڈسورتھ نے انگریزی شاعری کو دی - اور پھر یہ بھی نہ بھولئے کہ حالی سے اُردو شاعری میں جدید اسلوب کی وہی تحریک شروع ہوئی جو انگریزی شاعری میں ورڈسورتھ اور کولرج سے ہوتی ہے - اُردو شاعری میں آج جو سیدھا پن اور فطری انداز پایا جاتا ہے اسکے موجد اور مبلغ حالی

حالی کی شاعری فلسفہ اور تصوف سے بالکل خالی ہے - ان کے اندر کوئی فلسفیانہ بصیرت یا عارفانہ رمز شناسی نہیں تھی - یہ ان کی فضیلت بھی ہے اور کمزوری بھی - فضیلت اس اعتبار سے کہ یہی خصوصیت ہے جو اور شاعروں کے مقابلے

میں ان کو عوام الناس سے زیادہ قریب اور مانوس بنائے ہوئے ہے۔ ورنہ ان کے اندر گہرائیاں ہوتیں تو وہ جمہور کے شاعر نہ ہو سکتے۔ لیکن یہی ان کی کمزوری ہو جاتی ہے کیونکہ اس کمی کی وجہ سے وہ نہ تو کوئی تعمیری تخئیل (Constructive Ideal) پیش کر سکے ہیں اور نہ اپنے ترنم میں کوئی تنوع (Variety) ان کی ہر دُھن ایک ہی دُھن معلوم ہوتی ہے۔ جس کو مجموعی اعتبار سے مرثیہ کی دُھن کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ مرثیہ کی عامیانہ قسم کی عام رقت پسندی اور (یا افادی الاقتصادی مرحوم کی اصطلاح میں) تیسرے درجہ کے اُبل پڑنے والے جذبات سے وہ منزلوں دور تھے۔ مگر اس کا سبب وہی توازن و استقلال ہے جس سے حالی کا خمیر ہوا تھا۔ اور جس کی طرف اشارہ کر چکا ہوں

حالی میں ہم کو دو چیزیں ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ واقعیت (Realism) اور عقلیت (Rationalism) انھیں دو چیزوں نے ان کو بچایا اور انھیں سے وہ کھوئے گئے۔ یہی واقعیت و عقلیت ہے جس نے حالی کے کلام میں وہ توازن اور ٹھیراؤ پیدا کیا جو کسی دوسرے اُردو شاعر میں نہیں ملتا۔ لیکن یہی معقول پسندی اور واقعہ کے ساتھ بڑھی ہوئی موانست تھی جس نے حالی کو اس لطیف ہذیان دیوانگی سے محروم رکھا جس کو شیلی "پُر آہنگ دیوانگی" (Harmonious madness) کہتا ہے اور جو دنیا کے مشہور ترین شاعروں اور ادیبوں کی فطرت رہی ہے ورنہ وہ اس سہولت کے ساتھ اپنا انداز بدل نہ دیتے۔ اور زمانہ کے ان میلانات اور اثرات کے سامنے اتنا جلد سر نہ جھکا دیتے جو سر سید کی سرکردگی میں تحریک علیگڈھ کی صورت میں رونما ہو رہے تھے۔ یہ سچ ہے کہ یہ تحریک مسلمانوں کے لئے اسی طرح ضروری اور مفید تھی جس طرح مریض کے لئے دوا۔ مگر یقیناً وہ وقتی اور عارضی بھی تھی اور اس زمانہ کی چیز تھی جبکہ مسلمان "فرنگی کے پیسہ کو مردار" سمجھتے تھے اور محنت و مشقت کو باعثِ ننگ و عار۔ آج جبکہ ہم ڈوم اور چنڈال کے پیسہ کو بھی حلال سمجھنے کے لئے تیار ہیں۔ آج یہ تحریک ہمارے لئے زیادہ سے زیادہ تاریخ کے صفحات میں اہمیت رکھ سکتی ہے۔ ایسی تحریکوں سے مغلوب ہو کر رہ جانا شاعر کے لئے زیبا نہیں۔ اس کو کسی خاص جگہ یا کسی خاص زمانہ کی چیز ہو کر نہیں رہنا چاہئے۔ اگرچہ اپنے زمانہ اور اپنی جگہ سے بالکل بے نیاز اور بے پروا رہنا بھی شاعر کی ایک ناقابل معافی کمزوری ہوتی ہے۔

حالی نے زمانہ کے ساتھ گھاٹے پر صلح کر لی اور اس کے ہر نشیب و فراز کو بغیر چون و چرا کے تسلیم کر لیا اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ میر و مصحفی کی روش کو چھوڑ کر "مغرب کی پیروی" میں لگ گئے جس سے انکو دراصل نہ فطرتاً کوئی مناسبت تھی نہ تربیتاً۔ کرتے کیا زمانہ کے میلان کے ساتھ مصالحت کر لینا نہ صرف سر سید کی تحریک تھی بلکہ حالی کی اپنی طبیعت[1] کا تقاضا بھی تھا۔ انکے پیغام کا ایک اہم جزو یہ بھی ہے۔

زمانے کا دن رات ہے یہ اشارا — کہ ہے آشتی میں مری یاں گزارا
نہیں پیروی جن کو میری گوارا — مجھے ان سے کرنا پڑے گا کنارا
سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

[1] ابھی آپ کہہ چکے ہیں کہ حالی کو فطرتاً کوئی مناسبت نہ تھی اور اب ان کی طبیعت کا تقاضہ ظاہر کرتے ہیں! (اڈیٹر)

خیر عام مسلمانوں کو ہوا کا رخ پہچان کر چلنا نہ اسوقت آتا تھا نہ آج تک آیا۔ لیکن حالی نے اپنی قوم کا کفارہ تنہا اپنی ذات سے ادا کرنے کا بیڑا اُٹھا لیا۔ زمانہ کا رنگ بدلا ہوا دیکھا تو ساری مروجہ شاعری ان کو ایک "ناپاک دفتر" نظر آنے لگی اور شاعروں کی حیثیت ان کی نگاہ میں "قلی اور تفر" سے بھی گر گئی۔ لیکن شاعری ان کی فطرت میں داخل تھی اور اس کو دبا کر فنا کر دینا ایسا آسان کام نہ تھا۔ خود حالی "مسدس" کے دیباچہ میں تسلیم کرتے ہیں کہ "یہ ایک ایسے ناسور کا منھ بند کرنا تھا جو کسی نہ کسی راہ سے تراوش کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے بخارات وروفی جن کے رکنے سے دم گھٹا جاتا تھا دل و دماغ میں تلاطم کر رہے تھے اور کوئی رخنہ ڈھونڈھتے تھے"۔ آخرکار دبائے ہوئے بخارات کو نکلنے کے لئے رخنہ مل گیا "غزل کے شاعر" نے لاکھ اپنی فطرت سے انکار کیا پھر بھی "مسدس" کا شاعر ہو کر رہا

یہ نہایت کھلی ہوئی بات ہے کہ مسدس حالی تبلیغی یا تنظیمی ادب (Propaganda literature) کے عنوان کی چیز ہے۔ یعنی وہ ایک خاص دور کی چیز ہے اور اس خاص دور میں بھی ملک کی ایک محدود جماعت کے لئے مخصوص ہے۔ لیکن وہ شاعری بھی ہے اور صحیح معنی میں شاعری۔ اور اس حیثیت سے اس کے اندر وہ تمام خصوصیات کہیں کم کہیں زیادہ موجود ہیں جو حالی کی عام شاعری بالخصوص غزلیات میں ملتی ہیں۔ خود حالی نے مسدس کو اُبالی کھچڑی سے تشبیہ دی جو مزہ لیکر نہیں کھائی جا سکتی۔ شمس العلما مولانا امداد امام اثر حالی کی رائے سے اتفاق کر کے کہتے ہیں کہ ہر گجی بریانی اور مرغ مسلم پکانے والا ایسی کھچڑی نہیں تیار کر سکتا۔ میں خود "مسدس" حالی کو ایک قسم کی پرہیزی کھچڑی سمجھتا ہوں مگر وہ اُبالی نہیں ہے۔ اس میں نمک اور دوسرے مسالے بڑے انداز سے ملے ہوئے ہیں۔ اگر آپ اس کو مزہ لیکر نہ کھائیے تو البتہ محض اُبالی معلوم ہوتی ہے۔ یہ پکانے کے کمال کی دلیل ہے

مسدس کی شان نزول جو کچھ بھی ہو۔ اس کے وجود میں آنے کے اسباب و محرکات لاکھ غیر شاعرانہ سہی، اس میں سرسید کی غیر شاعرانہ تحریک کے جو اثرات نمایاں ہیں وہ سب مسلّم لیکن مسدس کے ایک خاصے حصے میں جو شخص شاعری نہیں پاتا وہ مذاق شعر کے محدود اور ناقص ہونے کا ثبوت دیتا ہے بقراط کا جامہ پہن کر بھی حالی کا اپنا انداز قد چھپ نہیں سکتا اور صاف پہچانا جا سکتا ہے وہ ہم کو ہمارے مرض کا سبب اور اس کی علامت سمجھاتے ہوئے آئے لیکن ہم کو دھوکا دکھانا چاہئے۔ طبیب خود بھی اس مرض کے جراثیم سے بچا ہوا نہیں ہے جس کو تشخیص کر کے اس نے "تپ دق" بتایا ہے۔ البتہ اس نے اپنے پھیپھڑوں میں مصنوعی طور پر آکسیجن بھر لیا ہے جس سے اس میں تندرستی کی عارضی علامتیں آ گئی ہیں۔

جو لوگ مسدس کو شاعری نہیں سمجھتے ان کو عموماً دو جماعتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - ایک تو وہ جو تبلیغ و تنظیم کو شعر و ادب سے بلند و برتر چیز مانتی ہے اور "مسدس" کو شاعری کہنا اس کی توہین سمجھتی ہے اس جماعت میں خود حالی بھی شامل ہیں بلکہ اس کے علمبردار ہیں۔ دوسری جماعت وہ ہے جس نے شاعری کے مفہوم کو بے انتہا محدود کر لیا ہے اور جس کے مذاق

کو غزل کے سہل اور سستے کیف و اثر نے بگاڑ دیا ہے۔ تمام اصنافِ سخن میں غزل سے بڑھکر دھوکے کی چیز کوئی نہیں غزل شاعری کی معراج بھی ہو سکتی اور اس کو خوار و رسوا بھی کر سکتی ہے۔ اس سے ہمارے مذاق میں اگر ایک طرف رفعت و تمکنت آسکتی ہے تو دوسری طرف ہمارے مذاق کے رکیک اور مبتذل ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے۔ بہر حال اگر ہم مسدس میں شاعری محسوس نہیں کرتے اور اس سے لطف نہیں اُٹھا سکتے تو اس کی ذمہ دار اگر ایک طرف ہماری بڑھی ہوئی نفاست ہے تو دوسری طرف اسی حد تک ہمارے مذاق کی عامیانہ سہل پسندی بھی ہے۔ ورنہ مسدس غیر شاعرانہ ہوتے ہوئے بھی شاعری ہے

مگر ایک تیسری جماعت بھی ہے جس کی نگاہ میں شاعر کا مرتبہ مبلغ یا مصلح سے زیادہ بلند ہے۔ یہ لوگ کسی ایسے پیغام کو جو وقتی مصلحتوں پر مبنی ہو یا جس کا روئے خطاب کسی محدود جماعت کی طرف ہو شاعری کا صحیح موضوع نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ شاعر زمان و مکان کا غلام نہیں ہو سکتا۔ وہ تو ازل اور ابد کو اپنی مٹھی میں لئے ہوتا ہے۔ مسدس کا پیغام صرف ایک چھوٹی سی جماعت اور وہ بھی ایک خاص وقت کے لئے تھا جواب دفن ہو کر رہ گیا۔ پھر اس کو شاعری کیونکر کہا جائے؟

شاعری تو وہ ہے جو اپنی تمام وقتی اور مقامی خصوصیات کے ساتھ بھی عام بنی نوع انسان کے لئے یا کم از کم کثیر سے کثیر تعداد کے لئے ابد تک روشنی اور صدائے بازگشت کا کام کر سکے۔ مسدس پر اس جماعت کا یہ اعتراض کافی اہم اور قابلِ غور ہے اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسدس جہاں تک پیغام ہے وہاں تک شاعری نہیں ہے۔ مسدس کے اہم ترین ٹکڑے وہ ہیں جن میں یا تو اسلام کی گزشتہ شان و شوکت کی تصویر دکھائی گئی ہے یا ہندوستان کے مسلمانوں کی موجودہ ابتری اور پستی کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور یہ ٹکڑے شاعری کے مکمل نمونے ہیں جن کو پڑھکر ماننا پڑتا ہے کہ حالی کی غزلیات اور ان کے مسدس میں در اصل کوئی تصادم نہیں ہے۔ وہی انسانی دردمندی اور دلسوزی۔ وہی جذبات کی سنجیدگی وہی دھیما، تھما ہوا لب و لہجہ اور وہی زبان کی سادگی اور بے ساختگی۔ غرضکہ وہی تمام خصوصیات جو ان کی قدیم و جدید غزلیات۔ یا "حبِ وطن"۔ اور "مناجات بیوہ" کو شاعری بنائے ہوئے ہیں۔ مسدس میں بھی نمایاں ہیں مسدس اپنے موضوع پر اور اپنی نوعیت کی نہ صرف اُردو میں بلکہ شاید دنیا کی اور زبانوں میں بھی سب سے زیادہ طویل نظم ہے اس پر بھی ملک میں اس قدر مقبول ہوئی کہ گھر گھر پڑھی گئی اور کسی زمانہ میں بار بار پڑھی گئی۔ ایسی طویل نظمیں عموماً پڑھنے والوں کو تھکا دیتی ہیں۔ لیکن مسدس اس عیب سے پاک ہے۔ شروع سے آخر تک پڑھ جایئے۔ نہ کہیں گرانی محسوس ہوگی نہ جی اُکتائے گا۔ مسدس حالی کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب اس کا تسلسل اور زبان کی سنجیدہ سادگی ہے جو اسکی تاثیر کے وزن کو اول سے آخر تک یکساں قایم رکھے ہوئے ہے

آخر میں مسدس کے متعلق پھر بھی ایک سوال ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر مسدس شاعری ہے تو کس مرتبہ کی اور مستقبل میں اس کو کیا حیثیت دیجائے گی؟ یہ تو نہایت کھلی ہوئی سی بات ہے کہ غزل یا خالص داخلی شاعری کی تاثیر و مقبولیت تو مسدس جیسی نظم کو کبھی میسر نہیں ہو سکتی۔ آخر فردوسی، نظامی اور جامی یا ہومر۔ ورجل اور ڈانٹے کو غزل یا (ممکن ہو سکا)

والی بات کہاں نصیب ہوئی۔ لیکن انسان کی زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں جبکہ وہ غزل کی ساحرانہ آواز کی طرف سے کان بند کرلیتا ہے۔ اور یہ ساحرہ اپنی تمام ساحری کے باوجود اس کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں خارجی شاعری کا وجود ہی نہ ہو پاتا۔ جو لوگ آج غزل کو حقیر سمجھ رہے ہیں اور اس کو بے حیثیت اور ذلیل ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں وہ تو خیرا پنے مذاق شاعری کو ناقابل اعتبار ثابت ہی کر رہے ہیں۔ لیکن جو لوگ شاعری کو صرف غزل تک محدود رکھتے ہیں وہ بھی اپنی تنگ حوصلگی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ہمارے مذاق کو ابھی بہت کچھ وسیع، متوازن، اور مہذب ہونا ہے۔ مسدس غزل نہ سہی لیکن مرثیہ ضرور ہے اور نہایت بلند معیار کا جو بحیثیت مجموعی ہم کو افسردہ اور بیدم نہیں کر دیتا۔ تاریخ اسلام کے ایک خاص رُخ کو اس سے زیادہ دلکش اور پر تاثیر پیرایہ میں نہیں پیش کیا جاسکتا ؟

رہ گیا یہ سوال کہ آیندہ مسدس کو کیا حیثیت ملے گی ؟ میرا خیال ہے کہ اس کو کسی قوم کی منظوم انجیل یعنی (Bible) کا درجہ تو نہیں حاصل ہو سکتا لیکن اُردو مرثیوں سے تو اس کو بلند ماننا ہی جائے گا۔ اس لئے کہ اس میں تغزل کے لطیف عناصر بھی موجود ہیں اور اگر ہم کو غم دنیا سے سر اُٹھانے کی اتنی مہلت ملی کہ شعر و ادب سے لطف اُٹھا سکیں تو آیندہ یقیناً وہ اس سے زیادہ پڑھی جائے گی جتنی کہ اس وقت پڑھی جاتی ہے۔ اپنے وقت میں تو وہ شاعری سے زیادہ پیغام سمجھی گئی اب وہ زمانہ آرہا ہے کہ اس کو شاعری میں شمار کیا جائے

اگر حالی کی مسدس میں کوئی فلسفۂ تمدن (Social Philosophy) یا کوئی واضح اور متعین مرکزی تخئیل ہوتی یا اگر اس میں کوئی مسلسل اور مربوط داستان بیان کی گئی ہوتی تو آج وہ رامائن۔ مہابھارت، شاہنامہ، ایلیڈ، اور پیراڈائز لاسٹ کے ٹکر کی چیز ہوتی، تاہم ان تمام خصوصیات سے معرا ہوتے ہوئے بھی مسدس جتنی پڑھی گئی ہے شاید ہی اس قسم کی کوئی دوسری طویل نظم پڑھی گئی ہو

حالی کی تیسری حیثیت سے بحث کرنا باقی ہے۔ یعنی ان کی تنقید نگاری۔ یہ حالی کی وہ حیثیت ہے جس پر کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہاں آکر رائیں ایک ہو جاتی ہیں۔ حالی نے نہ صرف اُردو شاعری کو جدید راستہ پر لگایا بلکہ وہ اُردو تنقید اور سیرت کے بھی مجتہد ہیں۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے سیرت اور تنقید نگاری میں مغربی اُصول فن کو رواج دیا۔ اور اُردو میں ادب کی ان دو اہم صنفوں کو معیار کی چیزیں بنا کر پیش کیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ تنقید میں حالی اُردو کے ڈرائڈن (Dryden) ہیں۔ جس طرح ڈرائڈن نے انگریزی تنقید میں نئی روح پھونکی اور جدید فنِ تنقید کی بنیاد ڈالی اسی طرح حالی نے اُردو تنقید کو تذکرہ نگاری کی سطح سے بلند کرکے ایک علمی اور تحقیقی فن کی صورت دی

جو خصوصیات حالی کی شاعری میں گنائی گئی ہیں۔ وہی ان کی تنقیدوں کی بھی شان امتیازی نظر آتی ہے یعنی وہی توازن اور وہی معقول پسندی۔ سر سید کے ساتھ انھوں نے جس بڑھی ہوئی عقیدتمندی اور جانبداری کا اظہار کیا ہے اس کے لئے اگر رواداری کا ایک حاشیہ چھوڑ دیا جائے اور اس جگہ ان کو محض اُردو کا باسویل (Boswell)

تصور کر لیا جائے۔ تو اُردو میں ایسا معقول پسند اور منصف مزاج نقاد کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ یہاں بھی وہ افراط و تفریط کے قایل نہیں۔ نہایت سنجیدگی کے ساتھ بغیر ماتھے پر شکن ڈالے ہوئے اپنی جنچی تلی رائے دیتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس کا خاص لحاظ رکھتے ہیں کہ کوئی بات اتنی گہری نہ ہونے پائے اور زبان و بیان میں کہیں اتنی ادبی خصوصیات نہ اکٹھا ہو جائیں کہ وہ مدرسہ کی چیز ہو کر رہ جائے اور ہر خاص و عام اس کو نہ سمجھ سکے۔ شاعری ہو یا نثر حالی ہر جگہ میر کی طرح اس مقولہ پر عمل کرتے نظر آتے ہیں

بات میری ہے گو خواص پسند پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

پھر اگر صرف ایک صاحب اسلوب کی حیثیت سے دیکھا جائے تو بھی حالی اُردو نثر میں ایک زبردست شخصیت کے مالک ہیں۔ اگر سرسید کے ساتھ حالی کی نثر وجود میں نہ آجاتی تو غالب کی نثر کے باوجود اُردو نثر شاید اسی جگہ رہجاتی جہاں مرزا رجب علی بیگ سرور نے اس کو چھوڑا تھا اور اس قابل نہ ہوتی کہ اپنی ادبی حیثیت قایم رکھتے ہوئے بے تکلفی اور سہولت کے ساتھ کسی سنجیدہ موضوع پر بحث کر سکے۔ سرسید کی اخباری نثر میں ادبی جان بالکل نہیں تھی اور اس سے اُردو میں کوئی ادبی تحریک نہیں شروع ہو سکتی تھی اس لئے کوئی ادیب ان کے اسلوب کی تقلید نہیں کر سکتا تھا۔ حالی سے اُردو نثر کے اسلوب میں وہی تحریک شروع ہوئی جو انگریزی میں بیکن (Beacon) سے ہوئی۔

بلیک ڈائمنڈ

ہندوستان کا واحد بے ضرر خضاب

اسوقت بازار میں مختلف ناموں کے خضاب بکثرت نظر آتے ہیں لیکن یہ تمام خضاب ایک ہی چیز ڈایامین سے طیار ہوتے ہیں جو بے انتہا ارزاں چیز ہو لیکن اسکے استعمال کا نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ چند دن کے بعد چہرہ پر آماس آجاتا ہے، نزلہ کی شکایت پیدا ہوجاتی ہے اجلد پر دانے پڑکر زخم کی صورت اختیار کرلیتے ہیں اور بعض مرتبہ اس کا زہر آہستہ آہستہ خون میں پوری طرح سرایت کرجاتا ہو اور ہلاکتیں بھی ہوجاتی ہیں، کیونکہ ڈایامین میں نہایت مہلک قسم کا زہر ہے اور صرف چمڑا رنگنے کے کام میں لایا جاتا ہو۔ ہمارا خضاب ڈایامین یا کسی زہریلی چیز سے بالکل پاک ہے اور اسکے استعمال سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوسکی یہ بالوں کو اصلی سیاہ رنگ دیکر انکی چمک اور مضبوطی کو بھی قایم رکھتا ہو اور جلد پر دھبے نہیں آنے دیتا قیمت علاوہ محصول ایک بکس ۹ر ایک شیشی میں محصول ۶ر صرف ہوجاتا ہو اسلئے جتنی زیادہ شیشیاں طلب کیجائیں گی اتنا ہی فایدہ ہوگا۔ ہر شہر میں ایجنسیاں درکار ہیں۔ کمیشن کے متعلق خط و کتابت کیجئے۔

کارخانہ خضاب بلیک ڈائمنڈ لکھنو

مکتوبات نیاز

قبلہ میر صاحب

کل بیٹھے بیٹھے ایک بات ذہن میں آئی، اسے آپ الہام و القار تو کہیں گے نہیں، لیکن اگر اسکو میری "کرامت" ہی مان لیں تو خیر میں زیادہ حجت نہ کروں گا اور وہ بات آپ کو بتا دوں گا

آپ کہیں گے کہ جب تک میں وہ بات بتاؤں نہیں آپ کیا کہہ سکتے ہیں۔ اور مجھے یہ ڈر ہے کہ اگر میں نے اسے ظاہر کر دیا تو آپ کہیں گے یہ تو مجھے پہلے ہی سے معلوم تھی۔ اچھا تو یوں کیجئے، آپ آیندہ جمعہ کو مراد آباد جا ہی رہے ہیں، دو گھنٹے کے لئے لکھنو ٹھہر جائیے اور مجھ سے وہ بات سن لیجئے۔ زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ چیز جو "برتر از قیاس و گمان و خیال و وہم" ہو، اس کا حال صرف ہم جیسے "صاحبانِ کشف و کرامات" ہی سے معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن آپ کی تشویش دور کرنے کے لئے فی الحال اتنا عرض کر دینے میں کوئی حرج نہیں کہ "جس گوہر مقصود" کے لئے آپ اسقدر بیتاب ہیں اس کا حصول اب "دایرۂ امکان" سے باہر نہیں رہا۔ لیکن یہ سُنکر خوشی کے مارے آپ جمعہ سے پہلے ہی نہ چل پڑئے، کیونکہ میں خود آج دو دن کے لئے باہر جا رہا ہوں

لاحول ولا قوۃ، یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ میں نے کہا "یوں نہیں یوں" اور تم نے بھی کہدیا کہ "ہاں"۔ میں سمجھتا تھا کہ تم اس کی مخالفت کروگے، میں دلایل پیش کرونگا تم پھر انہیں رد کروگے اور اس طرح مہینے دو مہینے تک گفت و شنود کا سلسلہ جاری رہے گا، لیکن تمہاری "ہاں" تو کسی کی "نہیں" ہو کر رہ گئی۔ اب بتاؤ کیا کروں

آپ نے جس "آفتِ جاں" کا حال دریافت کیا ہے وہ آجکل بمبئی میں ہے۔ زرنگیں جلوہ غارتگرِ ہوش۔ کہاں؟ — یہ خبر نہیں — کیوں؟ یہ معلوم ہے لیکن بتانے کی ہمت نہیں۔ تم نے یہ شعر سُنا ہوگا:۔

نہ من او فتادہ تنہا بکمندِ آرزویت
ہمہ کس سرِ تو دارد، تو سرِ کدام داری؟

یہ سوال کہ "سرِ کدام داری؟" بہت خطرناک ہے، کیونکہ اگر اس کے جواب میں کسی اور کا نام لے دیا گیا (جو بالکل یقینی ہے) تو پھر کیا ہوگا؟ — اب آپ غالباً سمجھ گئے ہوں گے کہ بتانے کی ہمت کیوں نہیں ہے۔ بہر حال "چون وچرا" میں پڑے بغیر ایک "دُنیائے خیال" میں نے اپنی علحدہ قایم کرلی ہے اور اسی پر قانع ہوں اور سوائے اس اولین لمحہ کے جو "فلسفہ ومنطق" سے بے نیاز ہے، مجھے کچھ یاد نہیں۔ جانتے ہو کہ وہ "اولین لمحہ" کیا تھا؟ — یہ:-

لبش بدیدم و لعلم بیو فتاد از چشم
سخن شنیدم و قیمت برفت لولورا

مکرمی - نوازشنامہ پہونچا - آپ نے غالب کے شعر پر جس لطیف پیرایہ میں اظہار خیال فرمایا ہے، اس کی داد نہ دینا ظلم ہے، گو بعض جگہ آپ کی غیر معمولی ذہانت کے معیار سے وہ گرا ہوا نظر آتا ہے

موسمِ دیر غنودن بہ شبستاں آمد

اس مصرعہ میں غَنودن (بہ فتحِ غین ہو) یا غنودن (بہ ضمِ غین) ایک ہی بات ہے۔ معناً تھوڑا سا فرق ان میں ضرور پایا جاتا ہے، یعنی غَنودن، مطلق محوِ خواب ہونے کے معنے میں آتا ہے اور غُنودن آرام سے پڑے رہنے کے مفہوم میں بھی مستعمل ہے۔ شبستاں سے مراد صرف خوابگاہ ہے، اس میں کسی اور پوشیدہ نسبت و اضافت کے بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب رہا یہ کہ "موسمِ دیر غنودن" سے کونسا موسم مراد ہے۔ سو اس خاص موقعہ پر "مے و معشوق" وغیرہ کی رعایت کا کوئی سوال نہیں، کیونکہ اس قصیدہ کا پہلا ہی شعر

عید اضحیٰ بہ سرِ آغاز زمستاں آمد
وقتِ آراستنِ حجرۂ و ایواں آمد

صاف بتا رہا ہے کہ کس موسم کا ذکر ہے۔ علاوہ اس کے "موسمِ دیر غنودن" والے شعر کے پہلے مصرعہ میں بھی صراحت موجود ہے کہ دن گھٹنے لگا ہے اور رات بڑھنے لگی ہے

اسی لئے میں نے عرض کیا کہ یہ شعر آپ کی بڑھی ہوئی ذہانت کا متحمل نہیں ہے — امید ہے مزاج بخیر ہوگا

حضرت المطالع ۔ میں آپ کا کہلاؤں اور دنیا سے روپوشی اختیار کروں ! یہ کیونکر ممکن ہے

ہر کہ رو سوئے تو دارد بہ جہاں قبلہ نماست

"خلوت و تنہائی" سے میری مراد، نہ دنیا سے کٹ کر علحدہ ہو جانا تھا اور نہ اصحاب کہف کی طرح کسی غار میں چھپکر خوابِ جمود اپنے اوپر طاری کر لینا۔ بلکہ مدعا صرف یہ کہنا تھا کہ جب صورتِ حال یہ ہو کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ

برتر ازاں ست کہ گفتن تواں،

تو پھر کیوں "نہ گفتن ہم خوش ست" پر عمل کیا جائے

باوجود دل کھولکر نہ کہہ سکنے کے بھی جب دنیا میری بات نہیں سمجھتی، تو آپ ہی اندازہ کیجئے کہ اگر کبھی واقعی میں وہ سب کچھ کہہ سکا جو کہنا چاہتا ہوں تو کیا ہوگا

یہ آپ نے بالکل درست فرمایا کہ

اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

لیکن میں نے جس حال کے تحت آپ کو خط لکھا تھا وہ کچھ اس قسم کا تھا کہ

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہمتو فارغ ہوئے شتابی سے

فرق صرف اتنا ہے کہ میر فراغت کا مفہوم موت قرار دیتا ہے اور میں صرف سکوت۔ بہر حال یہ بھی کہنے کی باتیں ہیں ورنہ میں خوب جانتا ہوں کہ اس روگ کا کوئی علاج نہیں

در خرمنِ صد زاہد و عاقل زند آتش
آں داغ کہ ما بر دلِ دیوانہ نہادیم

صدیقی ۔ آپ کچھ ارشاد فرمائیں اور میں نہ سنوں ! آپ کوئی حکم دیں اور میں اسکی تعمیل نہ کروں ! یہ آپنے کیا فرمایا ؟ لیکن اس کا کیا علاج کہ ۔ "دارم دلے ز آبلہ نازک نہاد تر"

محبت تو خیر بڑی چیز ہے، میں دشمنی میں بھی شرکت و رقابت گوارا نہیں کر سکتا۔ آپ کو معلوم ہو کہ دنیا میں صرف چند نفوس ("چند" بھی مبالغہ ہی سمجھئے) ایسے ہیں جن سے دل کا معاملہ رکھتا ہوں اور صرف اس لئے کہ جو خصوصیت ان کو مجھ سے ہے کسی اور سے نہیں ۔ عرصہ ہوا اسی چیز کو میں نے یوں ظاہر کیا تھا:۔

انچہ بہ دیگراں کنی آں بہ دل نیاز ہم !
او ز تو خواست اندکے شیوۂ امتیاز را

پھر ظاہر ہے کہ یہ "شیوۂ امتیاز" ایسی ارزاں جنس نہیں کہ ہر جگہ آسانی سے دستیاب ہو سکے اور ایسا ہو بھی تو مجھ میں وہ کونسی ایسی بات ہے جو اس مطالبہ کو کوئی پورا کرے۔ شیطان نے اسی ضد میں خدا کو چھوڑا اور میں نے ساری دنیا کو

صورتِ حال آپ کے سامنے ہے، اب آپ ہی فرمائیے کہ عذر پیش کروں بھی تو کیا اور ارشاد گرامی کی تعمیل کروں تو کیونکر؟۔ میں بالکل صحیح عرض کرتا ہوں کہ یہ تو خیر آپ کا فرمان ہے اگر کوئی اور ہوتا تو بھی مجھے تامل نہ ہوتا، لیکن دل کو علٰحدہ رکھ کر کوئی کام مجھ سے آج تک ہوا ہے نہ آیندہ ہونا ہے۔ رہا "ولے بر ندش" کا معاملہ سو اس کے لئے مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ آئیے اور ذبح کر کے چلے جائیے

محترمہ۔ ہر چند "آشنا گاہے، گہے نا آشنا" والی ادا مجھے پسند نہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ آپ کا کبھی کبھی یاد کر لینا بھی "جلوۂ برقِ شراب گاہ گاہی" سے کم نہیں مہینوں اُس طرف کی بات ہے جب آپ کی آخری تحریر رامپور سے وصول ہوئی تھی اور ہر چند اس میں کافی برہمی کا اظہار کیا گیا تھا، لیکن چونکہ یہ کوئی نئی بات نہ تھی میں بھی حسبِ عادت ایک آہ سرد بھر کر خاموش ہو گیا۔ اِس وقت اس نزاع کو تازہ کرنا مناسب نہیں کہ آپ نے ہمیشہ میری اس معذرتِ خاموش کو "خودسری" پر محمول کیا اور میں نے بیکسی و بیچارگی پر

اب آپ نے پھر "ساحلِ اپالو" سے مجھے یاد فرمایا تو خیال آیا کہ اس داستان کا گزشتہ باب کس سین پر ختم ہوا تھا!

زلفِ برہم نثارِ مستیِ چشم!

اچھا تو یہ بتائیے کہ اب کیا ارادہ ہے۔ وہی ابتلا و آزمائش، وہی امتحانِ صبر و وفا اور وہی مطالبۂ "کج دار و مریز" مناسب ہے ـــ اسلام کی شرط "ورزشِ ایماں بالغیب" ہو یا نہ ہو لیکن محبت و خلوص کے معاملہ میں میرا اصول ہمیشہ یہی رہا ہے، اس لئے صبر نہ کروں گا تو کیا کروں گا

سیاسیات کے باب میں بڑی حد تک میں آپ کا ہم خیال ہوں، لیکن اسلوب کار میرا اور ہے آپ کا اور، اس مہینے کے ملاحظات ملاحظہ فرمائیے، شاید میں کوئی قابلِ اطمینان وضاحت کر سکا ہوں۔ تقریروں کے متعلق آپ نے خوب رائے دی۔ انتقاد آپ کا حصہ ہے ـــ اور ہاں یہ تو بتائیے اب آپ ہیں کیسی؟ پروانۂ راہداری عطا ہو تو حاضر ہوں؟

حضرت۔ آپ نے بالکل درست فرمایا "خوباں" سے چھیڑ چلی جانے میں تو کوئی حرج نہیں، لیکن

"وصل" آپ کے حصہ میں آئے اور حسرت میرے حصہ میں! اس پر مفاہمت ذرا دشوار ہے

محض آپ کے ارشاد کی تعمیل میں یہ بحث میں نے چھیڑی تھی، اس امید پر کہ آپ میرا ساتھ دیں گے، لیکن معاف فرمایئے، آپ نے بالکل خلاف توقع وہی حرکت کی جو کوفیوں نے کی تھی، بہتر ہے، میں تو شہید ہوا جاتا ہوں، لیکن یہ یاد رہے کہ آپ بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یزید کی سی قسمت پانا آسان نہیں۔ اس کی ہستی کو تو حسین نے غیر فانی بنادیا اور میں یہ مرتے مرتے کسی سے نہ کہوں گا کہ "آپ کا فریب خوردہ" ہوں ہو سکتا ہے کہ آپ پر آپ کے ازار بندی رشتہ داروں کا دباؤ پڑا ہو۔ لیکن کیا آپ کے نزدیک دوستی کا تعلق اتنا کمزور ہے کہ وہ ایک "غمزۂ ناروا" کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا

میں یہ شکایت اس لئے نہیں کرتا کہ میری آیندہ راہیں بند ہو گئی ہیں بلکہ محض اس بنا پر کہ اگر اس کے بعد میرے قلم سے کوئی ایسی بات نکل جائے جو آپ کے لئے باعثِ تکلیف ہو، تو اس کی ذمہ داری میرے سر نہ رکھی جائے

اللہ، اللہ! آپ اور میرے حال پر دل دکھائیں۔ یہ میں کیا سُن رہا ہوں، کیا دیکھ رہا ہوں!

یک نگاہِ واپسیں اے شوق برگرداں مرا

اس زندگی میں مجھ کو کتنی بار فریب میں مبتلا کیا گیا، یہ تو یاد نہیں، لیکن اسقدر ضرور معلوم ہے کہ میری عمر کا دوسرا نام ہی "فریب خوردگی" ہے۔ اس لئے اگر میں آپ کے کہنے کو باور کرلوں تو میرے لئے قطعاً کوئی نئی بات نہ ہوگی، گو آپ اسے اپنی "فتوحات تازہ" ہی کیوں نہ قرار دیں

جی ہاں، فی الحال باہر جانے کا ارادہ نہیں ہے اور گیا بھی تو شاید دو دن کے لئے، شوق سے تشریف لایئے اور جو حربے قریب ہی پہونچکر استعمال کئے جا سکتے ہیں انھیں بھی کام میں لے آیئے۔ یوں شاید آپ کو میری ہلاکت کا یقین نہ آئے گا

مجموعۂ استفسار و جواب جلد سوم

کے خراب شدہ اجزاء پھر پریس جا چکے ہیں اور طباعت شروع ہو گئی ہے میں اب پھر کسی تاریخ کا تعین کرکے انتظار کی کشاکش میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا اور اب یہ یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ اس پرچے (فروری کا نگار) کے بعد اسکی روانگی شروع ہو جائے گی۔ جو خریداران نگار رعایت سے فایدہ اُٹھانا چاہتے ہیں وہ اب بھی عہ میں کتاب حاصل کر سکتے ہیں بشرطیکہ رقم پیشگی ارسال کر دیں ورنہ اشاعت کے بعد مع محصول عکر میں ملے گی۔ غیر خریداران نگار کے لئے اس کی قیمت ہیے مع محصول ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

سیاسیات یوروپ

مسٹر گنتھر جیکا گو ٹربیون (امریکہ) کا نہایت مشہور اڈیٹر ہے۔ اس نے ایک کتاب (Inside Europe) کے نام سے لکھی ہے جو چند سال کے اندر لاکھوں کی تعداد میں شایع ہو چکی ہے۔ اس تصنیف میں سیاسیات یورپ کی پیچیدگیوں اور موجودہ ڈکٹیٹروں کے خانگی و سیاسی زندگی کو جس وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہ نہ صرف اُردو داں بلکہ انگریزی داں جماعت کے لئے بالکل نئی چیز ہے

اس ماہ سے اس کتاب کا اقتباس شروع کیا جاتا ہے اور ابتداء ہٹلر سے ہوتی ہے۔ ہمیں اُمید ہو کہ قارئین نگار نہایت غور سے اس کا مطالعہ فرمائیں گے اور دول مغرب کے اُن باہمی رقیبانہ تعلقات کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کریں گے جنھوں نے اسوقت دنیا میں عجیب قسم کا ہیجان پیدا کر رکھا ہے (اڈیٹر)

ہٹلر۔ عجیب بات ہے کہ اسوقت دنیا میں جتنے اہم لیڈر اور ڈکٹیٹر پائے جاتے ہیں، ان میں سے کوئی اُس ملک سے وطنی تعلق نہیں رکھتا جہاں آج وہ حاکم مطلق بنے ہوئے ہیں۔ مصطفےٰ کمال سالونیکا (یونان) میں پیدا ہوتا ہے اور ترکی میں حکومت کرتا ہے۔ پلسڈسکی (Pilsudski) کا اصلی وطن لیتھونیا ہے لیکن حکومت کرتا ہو پولینڈ میں۔ شُشنگ کا مسقط الراس اٹلی ہے لیکن چانسلر ہے آسٹریا کا۔ اسٹیلن رہنے والا جارجیا کا ہے اور فرمانروائی کرتا ہے روس میں۔ اسی طرح ہٹلر پیدا ہوا آسٹریا کے ایک گاؤں میں لیکن ڈکٹیٹر بنا جرمنی کا

ہٹلر کے اجداد کا وطن، زیکوسلیویکا کی سرحد کے قریب ایک صوبہ والڈورٹل (Waldviertal) ہے جہاں کے باشندے غریب کسان ہیں اور صرف کھیتی سے اپنی معاش پیدا کرتے ہیں

ہٹلر کا دادا جوہان گیرگ ہیڈلر (Johann Georg Hiedler) اسی صوبہ کے ایک گاؤں اسپاٹل (Spital) میں فروری ۱۷۹۲ء کو پیدا ہوا تھا۔ ایک پن چکی والے کے یہاں کام کرتا تھا۔ اس کے پاس ایک عورت تھی جس کا نام میریا انا شکلگربر تھا۔ اس عورت سے ہیڈلر کے ایک لڑکا، قریب کے گاؤں اسٹرونس (Strones) میں ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوا جس کا نام الوئی ہٹلر (Alois Hitler) رکھا گیا اور

یہی موجودہ جرمنی کے ڈکٹیٹر اڈولف ہٹلر (Adolph Hitler) کا باپ تھا

ہٹلر کے دادا نے، ہٹلر کے باپ کے پیدا ہونے کے ۵ برس کے بعد ہٹلر کی دادی سے شادی کی مگر ہٹلر کے باپ نے اپنا خاندانی نام اپنی ماں کے خاندانی نام یعنی شکلگربر ہی پر رکھا۔ ۴۰ برس کی عمر تک ہٹلر کا باپ قانوناً اپنے والدین کی ناجائز اولاد ہی قرار دیا گیا۔ چالیسویں برس کہیں جاکر وہ قانوناً جائز اولاد بنا اور اُسوقت اُس نے اپنا نام الوئی ہٹلر رکھا "ہڈلر" کے "ہٹلر" ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ جس مقام پر ہٹلر کے باپ، دادا رہتے تھے وہاں کے کسان عموماً جاہل ہوتے ہیں اور صحیح تلفظ ادا نہیں کر سکتے۔ اس لئے رفتہ رفتہ "ہڈلر" "ہٹلر" بن گیا مگر ہٹلر کی بہن اب بھی اپنے آپ کو پالا ہڈلر لکھتی ہے

ہٹلر کے باپ نے تین شادیاں کیں۔ اس کی پہلی بیوی جس کا نام انا گلاسل۔ ہورر (Anna Glasl Horer) تھا، اپنے شوہر سے چودہ برس بڑی تھی مگر تھی دولتمند، چنانچہ اُس نے ہٹلر کے باپ کو جو اُس زمانہ میں موچی کا پیشہ کرتا تھا، ایک اسکول میں پہلے تو تعلیم کے لئے بھجوایا اور پھر کچھ رشوت وغیرہ دے کر اُسے آسٹریا کی سول سروس میں ایک جگہ بھی دلوادی۔ یہ ۱۸۸۲ء میں مرگئی مگر ہٹلر کے باپ نے صرف ۲ ہفتہ اس کا غم مناکر ایک دوسری عورت فرانزشکا میزلسبرگر (Franziska Matzelsberger) سے شادی کرلی لیکن یہ بھی ایک سال بعد مرگئی۔ اب کی مرتبہ ہٹلر کے باپ نے تین ہی مہینے کے بعد اپنی ایک دور کی بہن کلارا پوئلزل (Clara Poelzl) سے (جو اُس سے ۲۳ برس چھوٹی تھی) شادی کی۔ یہ کلارا، ہٹلر کی ماں تھی۔ شادی کے چار برس کے بعد براؤناؤ کے مقام پر ۲۰ اپریل ۱۸۸۹ء کو وہ بچہ پیدا ہوا جس کی قسمت میں آگے چل کر، نازی پارٹی کا پیشوا، جرمن فوج کا سپہ سالار، جرمنی کی تیسری پارلیمنٹ کا بانی، صدر، چنسلر اور جرمن قوم کا لیڈر بننا مقسوم ہو چکا تھا

جب ہٹلر، چھ برس کا تھا تو اس کی ماں کے سرطان ہو گیا اور وہ بھی دس برس تک اسی مرض میں مبتلا رہ کر ۱۹۰۵ء میں مرگئی

اڈالف ہٹلر کو اپنی ماں سے بہت زیادہ محبت تھی، اور کہا جا سکتا ہے کہ یہی ایک خوش نصیب عورت ایسی تھی جس سے ہٹلر کو انس تھا ورنہ ہٹلر کو اس صنف سے مطلق دلچسپی نہیں ہے۔ چنانچہ ہٹلر کے مزاج پر بھی بجائے باپ کے ماں کا بہت گہرا اثر پڑا ہے اور اگر ہٹلر اور اُس کے باپ کا مقابلہ کیا جائے تو دونوں میں زمین آسمان کا تفاوت نظر آئے گا۔ ہٹلر کا باپ پکا شرابی تھا، اور ہٹلر کے ہاتھوں نے کبھی اس کو چھوا بھی نہیں، ہٹلر کے باپ نے تین تین شادیاں کیں، ہٹلر نے کبھی کسی عورت سے محبت ہی نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہٹلر اپنے جذبۂ اولوالعزمی کے لئے اپنی ماں کا زیر بارِ احسان ہے۔ خود اس کی ماں چاہتی تھی کہ اس کا لڑکا، اپنے باپ سے مختلف ہو۔ اُسی نے ہٹلر کو مصوری سیکھنے پر بھی آمادہ کیا۔ مگر ہٹلر کا باپ ہٹلر کو بہت کاہل سمجھتا تھا اور اکثر اُسے مارتا تھا

ہٹلر کی ایک حقیقی بہن بھی ہے جس کا نام پاؤلا ہے - یہ ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئی اور ابھی تک اس نے شادی نہیں کی - وہ آج کل ویانا میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہی ہے - ویانا کے نازیوں نے اُس کو عروج دینا چاہا تھا مگر وہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئی

ہٹلر کی ایک حقیقی خالہ بھی زندہ ہے جو اسپائٹل میں رہتی ہے اور اس کے دو لڑکے بھی ہیں - مگر یہ پورا خاندان بہت مفلس ہے اور ہٹلر کو کسی سے کوئی دلچسپی نہیں

ہٹلر بحیثیت ایک انسان کے

ہٹلر ایک بے وقوف، اُلجھی ہوئی، تضاد پسند فطرت کا حامل ہے لیکن انہیں صفات میں اسکی طاقت و ہیبت کا راز مضمر ہے - کروروں جرمن ایسے ہیں جو اسے قابل پرستش ہستی سمجھتے ہیں اور اس کا نام ان کے دلوں میں محبت، خوف اور قومیت کا ایک طوفان بپا کر دیتا ہے، مگر اسی کے ساتھ بہت سے جرمن ایسے بھی ہیں جو اُسے ایک کمزور، مضحکہ خیز باتیں بگھارنے والا انسان سمجھتے ہیں

ہٹلر کا تخیل بھی بہت پست معلوم ہوتا ہے - اُس نے جو تصویریں ایک زمانہ میں کھینچی تھیں ان میں کوئی خوبی نہیں پائی جاتی

ہٹلر کا زمانۂ تعلیم بھی بہت مختصر رہا ہے - وہ اب بھی کچھ نہیں پڑھتا ہے بلکہ غالباً اُس نے صلحنامۂ ورسیلز کا بھی پوری طور سے مطالعہ نہیں کیا - پڑھے لکھے آدمی اُسے پسند نہیں - اگر اُس کے عہد شباب کو جو اُس نے آسٹریا میں بسر کیا تھا نکال دیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ جرمنی سے باہر کہیں نہیں گیا - (بجز اس کے کہ دوران جنگ میں البتہ کچھ عرصہ تک باہر رہا اور ۳۴ء میں ایک مرتبہ مسولینی سے وینس میں ملنے گیا) وہ تھوڑی سی فرانسیسی زبان کے علاوہ کوئی دوسری غیر ملکی زبان بھی نہیں بولتا - وہ کسی بات کا فیصلہ بھی جلد نہیں کر پاتا

غیر ملکی نمایندے یا اخبار والوں سے وہ ملتا ضرور اچھی طرح ہے مگر خود انھیں سوال کرنے کا بہت کم موقع دیتا ہے - وہ خود ہی بولتا رہتا ہے اور اس طرح گویا وہ ایک "جلسۂ عام" میں گفتگو کر رہا ہے

ایک زمانہ میں کہا جاتا تھا کہ وہ بہت وفادار شخص ہے بلکہ مذاقاً یہ مشہور ہو گیا تھا کہ وہ ان تین چیزوں کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا:- یہودی، اپنے دوست اور آسٹریا لیکن جب اس نے اپنے عزیز ترین دوست کپتان روہم کو قتل کرا دیا تو غالباً اب کوئی شخص اسے وفا شناس نہیں کہہ سکتا - وہ تقریباً اپنے تمام دوستوں کو جو اس کی عظمت کا باعث تھے قتل کرا چکا ہے - ہر چند بعض دوستوں پر وہ اب بھی مہربان ہے مگر یہ وہی دوست ہیں جو اس سے کبھی اختلاف نہیں کرتے

اس کی بہادری بھی مشکوک ہے - جب ۱۹۲۳ء ہنگامۂ میونخ میں اس کے آدمیوں پر گولیاں چلائی گئیں

تو وہ سڑک پر اتنی زور سے گر پڑا کہ اس کا بازو ٹوٹ گیا۔ اس کے نازی دوست اس فعل کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ وہ ایک آدمی کو سہارا دئے کھڑا تھا کہ دفعتاً وہ گولی کھاکر گرا اور اسی کے ساتھ وہ بھی گر پڑا اور بعض یہ کہتے ہیں وہ نہایت ہوشیاری سے ایک آزمودہ سپاہی کی طرح گولیاں چلتے وقت زمین پر لیٹ گیا تاکہ گولیاں اس کے اوپر سے گزر جائیں اور اس کے نہ لگیں

ہٹلر کو جنگ عظیم کی خدمات کے صلہ میں "آئرن کراس" بھی ملا تھا۔ یہ کراس کیسے ملا اس کے متعلق خود اُس کا ایک بیان مشہور ہے کہ وہ ایک مرتبہ جنگ کے دوران میں ایک پیغام اپنے جنرل کے پاس ایک ایسے حصۂ ملک سے لئے جارہا تھا جو کسی کے قبضہ میں نہیں شمار کیا جاتا تھا اور جس کے متعلق یہ خیال تھا کہ یہاں دشمنوں کی فوج نہیں ہے۔ اس کے پاس صرف ایک ریوالور تھا اور وہ ایک جنگل سے گزر رہا تھا کہ یکایک اُس نے چند فرانسیسیوں کی آوازیں سنیں۔ اُس نے اپنے حواس قایم رکھ کر ایک فرضی جرمن دستہ کو ان لوگوں کے گرفتار کرنے کا حکم دیدیا (گویا اُس کے ساتھ ایک پورا دستہ تھا) فرانسیسی یہ حکم سُن کر گھبرا گئے اور یہ سمجھ کر انھیں جرمن فوج نے گھیر لیا ہے اپنے ہاتھ اُٹھا دئے اور ہٹلر اکیلا ان کو پستول دکھاتا ہوا اپنی فوج تک لے گیا اور سب کو گرفتار کرادیا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے اس قصہ کے ساتھ یہ بھی بیان کیا کہ اگر فرانسیسیوں کے بجائے یہ دستہ انگریز یا امریکن فوج کا ہوتا تو یہ ترکیب کارگر نہ ہوتی۔

ہٹلر جھوٹے وعدے کرنے میں بہت مشاق ہے، جس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً ایک دفعہ اُس نے یہ وعدہ کیا کہ وہ فان پیپن کی حکومت کی مخالفت نہیں کریگا مگر اُس نے کی۔ اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ پہلی کابینہ کے افراد میں تبدیلی نہ کرے گا مگر اُس نے یہ بھی کیا۔ ہٹلر کی عمر اب ۴۸ سال کی ہے۔ گو بظاہر نہایت تندرست معلوم ہوتا ہے مگر اس کی تندرستی بہت اچھی نہیں ہے۔ وہ اپنے ایک ہاتھ کو کہنی سے اوپر بمشکل حرکت دے سکتا ہے، بچپن میں اس کو پھیپھڑے کی بھی ایک بیماری ہوگئی تھی اور جنگ کے دوران میں زہریلی گیس کی وجہ سے اس کی آنکھیں بھی خراب ہوگئی تھیں۔ ۳۵ء میں اس کے گلے میں ایک معمولی آپریشن بھی کیا گیا تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے اپنی تقریر میں یہ کہا کہ "مجھے نہیں معلوم میری یہ آنکھیں کب ہمیشہ کے لئے بند ہوجائیں مگر میں یہ جانتا ہوں کہ ہماری جماعت زندہ رہے گی اور حکومت کرے گی ۔۔۔۔ لیڈر پیدا ہوتے رہیں گے اور مرتے رہیں گے مگر جرمنی زندہ رہے گا۔۔۔۔

اس تقریر سے یہ افواہ پھیل گئی کہ ہٹلر کے سرطان ہوگیا ہے

گو ہٹلر اب جنگی جہازوں کی نقل و حرکت میں دلچسپی لینے لگا ہے مگر وہ کسی قسم کی ورزش نہیں کرتا۔ اُس کی خاص تفریح "موسیقی" ہے اور وہ اکثر تھیٹر جایا کرتا ہے۔ وہ اپنے ایک دوست سے اکثر گانا بھی سنا کرتا ہے۔ مگر اُسے نہ تو کتابوں کی پرواہ ہے اور نہ کپڑوں کا شوق۔ وہ ایک معمولی خاکی قمیص اور نیلے سرج کے سوٹ کے علاوہ جس پر

وہ برساتی ڈال لیتا ہے شاذ و نادر ہی کوئی دوسرا کپڑا پہنتا ہے۔ اُسے نہ کھانے کا شوق ہے نہ پینے کا۔ نہ وہ سگرٹ پیتا ہے، نہ شراب، بلکہ وہ اپنے قریب بھی کسی کو سگرٹ نہیں پینے دیتا۔ وہ بالکل سبزی خور انسان ہے۔ کبھی کبھی کافی البتہ پی لیتا ہے اور چاک لیٹ بھی کھا لیتا ہے۔ اسی لئے لوگ اُس کے "زہد" کا بہت چرچا کرنے لگے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ اُس کے لئے یہ لفظ استعمال کرنا غلط ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ صرف ترکاری کھاتا ہے مگر وہ بہترین باورچی کے ہاتھ کی پکائی ہوئی ہوتی ہیں وہ رہتا بہت سادگی سے ضرور ہے مگر میونخ میں اس کا مکان آرائش و زیبائش کا مکمل ترین نمونہ ہے

ہٹلر کو برلن نہیں پسند ہے اور اُسے جب موقع ملتا ہے تو میونخ یا بویریا کے ایک گاؤں میں چلا جاتا ہے اور وہاں پہاڑ پر جاکر رہتا ہے۔ یہ خطہ آسٹریا کی سرحد سے بہت قریب ہے اس تفریح میں ایک اہم نفسیاتی پہلو پوشیدہ ہے!

ہٹلر کے دوست

کہا جاتا ہے کہ آدمی اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے — مگر ہٹلر کا کوئی دوست ہی نہیں! کپتان روہم کے بعد ہٹلر سے قریب ترین رہنے والا شخص اسکے باڈی گارڈ کا افسر لفٹنٹ برکنر ہے۔ وقت مقرر کئے بغیر صرف دو شخص اس سے مل سکتے ہیں۔ ایک تو فاں ریبن ٹراپ، اس کا مشیر امورِ خارجہ، اور دوسرے شیبت (Schmucht) اس کا مشیر اقتصادیات۔ اس کے بعض افسران مثلاً ڈیٹریچ (اس کا پریس سکرٹری) اور ہس (پارٹی کا ڈپٹی لیڈر) اُس سے روزانہ مل سکتے ہیں مگر اور افسران حتیٰ کہ گوئرنگ اور گوئبلس بھی بغیر پہلے وقت مقرر کئے نہیں مل سکتے۔

ایک مرتبہ ۱۹۳۲ء کے الکشن کے دوران میں وہ اتفاق سے ایک مصنف کے ساتھ دو مہینہ تک برابر گھومتا رہا مگر اس مصنف کا بیان ہے کہ وہ اپنے سکرٹریوں سے بھی بہت کم بولتا تھا

ہٹلر جذباتی بھی بہت ہے اور بعض اوقات اپنے جذبات سے مجبور ہو کر اس کا دل بھر آتا ہے اور وہ رونے لگتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ نازی پارٹی کے ایک لیڈر اٹو اسٹریسر کو جو پارٹی سے ناراض ہو گیا تھا تقریباً پوری رات مناتا رہا اور اس دوران میں وہ تین مرتبہ رویا

ہٹلر کو اپنی یہ کمزوری پسند نہیں۔ چنانچہ وہ اپنے اکثر ماتحتوں کو اپنے سے دور ہی رکھنا پسند کرتا ہے۔ یہ ماتحت اس کی پرستش کرتے ہیں مگر اُس سے واقف نہیں ہیں۔ وہ اُس سے برابر ملتے ہیں مگر اُس سے بے تکلف نہیں ہو سکتے۔ اس کے ایک خاص آدمی کا بیان ہے کہ اُس نے کبھی ہٹلر کو "ہر ہٹلر" کے علاوہ صرف ہٹلر کہہ کر نہیں پکارا اور نہ کبھی ہٹلر نے بے تکلفی کے ساتھ اس کا نام لیا

جب اُس کے پیرو اُسے نازی سلامی دیتے ہیں اور "ہیل ہٹلر" (زندہ باد ہٹلر) کہتے ہیں تو وہ بھی ہیل ہٹلر

پکار اُٹھتا ہے۔ جب ہٹلر تقریر کرتا ہے تو وہ حاضرین کو "میرے جرمنو" کہکر مخاطب کرتا ہے

ہٹلر اور صنفِ نازک

شہوانی نقطۂ نظر سے ہٹلر کو عورتوں سے مطلق دلچسپی نہیں ہے۔ عورتیں، اس کے نزدیک صرف اُن "ماؤں" کی حیثیت رکھتی ہیں جن کا کام میدانِ جنگ کے لئے سپاہی تیار کرنا ہے وہ اپنی خود نوشت سوانحعمری میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ "ہماری قوم کے آدمیوں کی زندگیاں موجودہ معاشقہ کی گھٹیا دینے والی خوشبو سے آزاد رہنی چاہئیں"۔ وہ عورتوں سے نفرت نہیں کرتا مگر ان سے علٰحدہ ضرور رہنا چاہتا ہے۔ فراگوئبلس نے اکثر ایسی دعوتیں کیں جن میں اُس نے حسین عورتوں کو اُس سے ملایا مگر ایسی کوئی عورت نہ نکلی جو اس کی رفیقۂ حیات بن سکتی۔ ایک مرتبہ یہ خبر اُڑ گئی تھی کہ ہٹلر، رچرڈ ویگنر کی بہو سے شادی کرنے والا ہے مگر اس میں کوئی اصلیت نہ تھی

اس کے پاس اکثر انگریزی اور امریکن لڑکیاں ملنے کے لئے آتی رہتی ہیں مگر ہٹلر ان سے صرف چلاچلا کے باتیں کرنے ہی پر اکتفا کرتا ہے۔ البتہ وہ ڈاکٹر گوئبلس کی چھوٹی لڑکی سے بہت مانوس ہے اور اکثر وہ اپنے کمرہ میں اس لڑکی کو اپنے گھٹنے پر بٹھائے رہتا ہے

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہٹلر کو امرد پرستی کا شوق ہے مگر اس میں بھی کوئی حقیقت نہیں۔ اکثر جرمن اخبار نویسوں نے ہٹلر کی معاشقانہ زندگی کی تفتیش کی کوشش کی اور جن جن مقامات پر ہٹلر رہا اور راتیں بسر کیں وہاں کے نوکروں، ہوٹل والوں اور قلیوں وغیرہ غرضکہ ہر طرح سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ آیا ہٹلر کا کسی سے تعلق ہے مگر اس تحقیقات کے بعد بھی ایسی کوئی شہادت نہ ملی جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا کہ ہٹلر کو کسی صنف کے فرد سے کوئی خاص دلچسپی ہے۔ چنانچہ جرمن اخبار نویسوں کو یہ یقین ہو گیا ہے کہ ہٹلر ابھی تک کنوارا ہے

ہٹلر اور روپیہ

ہٹلر کو بذاتِ خود روپیہ کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ اس کے ملازمین اس کی جائے قیام، اسکے موٹر کار اور کپڑوں وغیرہ سب کا انتظام حکومت کی طرف سے ہوتا ہے۔ ۳۴ء میں البتہ جب وہ مسولینی سے ملنے جا رہا تھا تو اس نے ایک برساتی خریدی تھی۔ ہٹلر، حکومت سے کوئی تنخواہ خود نہیں لیتا بلکہ اُسے اُس فنڈ میں جمع کرا دیتا ہے جو حادثہ سے بیکار ہو جانے والے مزدوروں کی امداد کے لئے مقرر ہے۔ ۳۵ء میں ہٹلر نے یہ اعلان کیا تھا کہ اُس کا کسی بنک میں کوئی حساب نہیں ہے اور غالباً یورپ کے موجودہ مدبرین میں یہی ایک ایسی ہستی ہے جس کا روپیہ کسی بنک میں جمع نہیں ہے۔ اس اعلان سے قبل یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ نازی اخباروں کی مشہور کمپنی کا حصہ دار ہے لیکن اعلان کے بعد یہ خیال بھی لوگوں کے دلوں سے جاتا رہا۔ بہرحال اگر ہٹلر کے پاس کوئی ذاتی رقم نہیں ہے تو اس نے اپنی خود نوشت سوانحعمری کی ساری آمدنی، اپنی پارٹی کو دے ڈالی ہو گی۔ اس کی یہ کتاب پڑھنا ہر جرمن کے لئے تقریباً فرض کے برابر ہے۔ حالانکہ اُس کی قیمت کافی ہے (یعنی تقریباً ۱۲ شلنگ) لیکن پھر بھی ۲۵ء میں شایع ہونے کے بعد اس وقت تک اُس کی ۱۱ لاکھ ۹۳ ہزار کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ اب اگر اس کتاب کی

فروخت میں ہٹلر کا کمیشن ۵ افیصدی بھی رکھا جائے تو بھی ۳۵ء کے آخر میں اس کے کمیشن کا مجموعہ ا لاکھ ۶۰ ہزار پاؤنڈ ہو گیا ہوگا

ہٹلر اور مذہب

ہٹلر رومن کیتھولک عیسائی پیدا ہوا تھا اور اسی مذہب میں اس کی پرورش بھی ہوئی مگر وہ بہت جلد تمام مذاہب سے غیر معتقد ہو گیا اور اب وہ کسی قسم کی مذہبی عبادت نہیں کرتا۔ اسکی حکومت نے جرمنی میں رومن کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور یہودی، سب کے خلاف محاذ جنگ قایم کر دیا ہے جس کی وجہ غالباً مذہب نہیں بلکہ سیاست ہے۔ ہٹلر کے نزدیک نازی انقلاب کا پہلا مقصد جرمنی کو مکمل طور سے متحد کرنا اور ایک قوم بنانا تھا اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ پارلیمنٹ میں کسی قسم کا مقابلہ ہو۔ دوسری طرف پاپائیت اور صیہونیت دونوں بین الاقوامی چیزیں تھیں اس لئے ان سے قطع تعلق کرنا اس کے لئے ضروری تھا! غالباً ان معاملات میں شدت کا باعث ہٹلر کا یہ جذبہ تھا کہ جرمنی کو غیر جرمن عناصر سے پاک کر دیا جائے۔ 'مہاجنوں' ([illegible]) کو اسی لئے ناپسند کرتا ہے کہ وہ غیر جرمن، دیگر مالیاتی طاقتوں کے نمایندے ہیں۔ اُسے اشتراکیوں اور 'اجتماعیوں' سے اس لئے نفرت ہے کہ ان کا تعلق عالمگیر جماعتوں سے ہے جن کا مقصد مزدوری کو بین الاقوامی بنانا ہے وہ "سکون پسندوں" ([illegible]) سے اس لئے ناراض تھا کہ جنگ کی مخالفت کرنے میں یہ بھی بین الاقوامی حیثیت رکھتے تھے

کیتھولک مذہب سے وہ خاص کر اس لئے خفا تھا کہ وہ ایک آدمی سے بیک وقت دو وفاداریاں چاہتا ہے اور ہٹلر اسے پسند نہیں کرتا کہ کوئی جرمن اُس کے ساتھ وفاداری کا اظہار کرنے کے بعد کسی دوسری ہستی (پوپ) کا بھی وفادار رہے۔ چنانچہ اس خیال کے ماتحت کیتھولک پادریوں کی ایسی مخالفت کی گئی کہ ایک مرتبہ تو جرمنی اور پاپائے روم کے سارے تعلقات ہی منقطع ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا

پروٹسٹنٹ مذہب کا بانی، لوتھر، چونکہ جرمن ہی تھا اس لئے یہ مذہب قومی مذہب بن سکتا تھا اور ہٹلر کا بھی یہی خیال تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک متحدہ پروٹسٹنٹ مذہب کے قیام کے لئے (جس میں "نازیت" کا کافی اثر ہو) ایک فوجی نازی پادری کو دوسرے پادریوں کا پیشوا بنا دیا مگر پادریوں کی طرف سے اس مسئلہ میں اس کی مخالفت کی گئی اور ابھی تک یہ قضیہ طے نہیں ہوا

اس جھگڑے کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے نازیوں نے جو پروٹسٹنٹ مذہب میں نازی عنصر داخل کرنا چاہتے تھے، جب اپنے مقصد کو بارآور ہوتے نہ دیکھا تو وہ ملحد بن گئے۔ اگر "نازیت" کو انتہا پسندانہ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے لئے تو ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو جدید ہو اور قومی ہو۔ چنانچہ ہٹلر نے بھی اس چیز کی طرف نیورمبرگ کے مقام میں ایک تقریر کرتے ہوئے یوں اشارہ کیا ہے کہ:- "ایک زمانہ میں عیسائیت، پرانی ٹوٹونک[1]

---

[1] ٹوٹونک (Teuton) ٹیوٹن اقوام جن میں جرمن، انگریز اور اسکنڈینیویا والے شامل ہیں۔ ٹوٹن، جرمنی کے قدیم ترین باشندے تھے

اقوام کو متحد کرنے میں ثابت ہوئی تھی مگر اصلاحات (Reformations) نے اس اتحاد کو ختم کر دیا۔ جرمنی اب ایک متحدہ قوم ہے۔ عیسائیت کو جہاں ناکامی ہوئی تھی وہاں قومی اجتماعیت فتحمند ثابت ہوئی ہے" ایک اور موقع پر ہٹلر نے کہا تھا "ہم بجز جرمنی کے کسی اور خدا کو نہیں چاہتے"

خدا سے، ہٹلر کو ایک شکایت یہ بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ بھی یہودی تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ نازی انقلاب کی بنیاد جرمنی کی شکست تھی۔ چنانچہ 'مذہب' میں 'نازیت' شامل کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ جو خدا فرانسیسیوں اور دیگر لیت اقوام کو جنگ میں کامیاب کرا دے وہ جرمنی کے لئے قابل اطمینان خدا نہیں ہو سکتا

ہٹلر کو ایک تو شروع ہی سے یہودیوں سے نفرت تھی دوسرے اس نے اس نفرت کو سیاسی اور اقتصادی رنگ بھی دیدیا یعنی یہودیوں کے خلاف اس کے دلایل یہ بھی ہیں کہ وہ جرمنوں سے نوکریاں چھینتے تھے، جرمنی کے پریس، تھیٹر اور فنون لطیفہ پر ان کا قبضہ تھا، ہر جگہ یہودی ڈاکٹر، یہودی وکیل، یہودی پروفیسر دکھائی پڑتے تھے، مختصر یہ کہ یہودی ایک وبائی صورت سے ملک پر چھا گئے تھے۔ غرض ہٹلر کو یہودیوں سے جتنی نفرت ہے وہ اسکے احکامات کے علاوہ اس کی خود نوشت سوانح عمری سے ہی بخوبی ظاہر ہو سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے ایک تماشہ دیکھنے کا ارادہ کیا تو اس کے سکرٹری نے پیرس تار بھیج کر پہلے یہ معلوم کرنا چاہا کہ اس تماشہ کا مصنف (جو پیرس میں رہتا تھا) کم از کم اپنے دادا۔ دادی تک آرین نسل کا ہے یا نہیں۔ چنسلر ہونے سے قبل ہی وہ کسی یہودی سے ٹیلیفون پر گفتگو کرنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اب بھی وہ کسی یہودی سے خواہ وہ کتنی ہی عظیم المرتبت شخصیت کا مالک ہو ملنا پسند نہیں کرتا حتیٰ کہ مشہور برطانوی مدبر، ہندوستان کے سابق وائسرائے لارڈ ریڈنگ کو بھی وہ شرف باریابی نہیں دے سکتا، کیونکہ وہ یہودی ہیں

ہٹلر کے لئے حفاظتی تدابیر ہٹلر کے باڈی گارڈ کے افسر کا نام لفٹنٹ برگنر (Brueckner) ہے برگنر کے دو خاص معاون تھے۔ ایک کا نام شواب (Schaub) اور دوسرے کا شرک (Schreck) تھا مگر موخر الذکر کا حال میں انتقال ہو گیا ہے۔ شواب، ہٹلر کے سفر کے لئے ہوائی جہاز اور موٹر وغیرہ کا انتظام کرتا ہے اور اسی سلسلہ کی دوسری ضروری باتیں طے کرتا ہے۔ کرنل ہنڈنبرگ کی طرح ہٹلر بھی کبھی ریلوے ٹرین پر نہیں سوار ہوتا۔ انگلستان کے مشہور اخبار "ڈیلی ہیرلڈ" نے ایکمرتبہ لکھا تھا کہ ان تین آدمیوں کے علاوہ ایک چوتھا آدمی بھی ہٹلر کے خاص باڈی گارڈ دل میں ہے جسے جرمنی میں سب سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ یہ شخص ہٹلر سے اتنا مشابہ ہے کہ دونوں میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا چنانچہ یہ "ہٹلر ثانی" اکثر موقعوں پر ہٹلر کی نمایندگی کرنے کے کام بھی آتا ہے اور اس کی ہستی سے یہ فایدہ ہے کہ اگر کوئی ہٹلر پر حملہ کرنا چاہے تو وہ پہچان نہ پائیگا کہ اصلی ہٹلر کون ہے۔ لیکن اس کی کوئی بنیاد نہیں

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ ہٹلر کو ہر قسم کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے بہت کوشش کیجاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ برکنز، شواب، اور سٹرک میں آپس میں یہ خفیہ عہد نامہ ہوگیا تھا کہ اگر ہٹلر کو کوئی گزند پہونچے گا تو وہ خود بھی خودکشی کرلیں گے

ہٹلر کی نگرانی کس طرح کی جاتی ہے اس کی ایک دلچسپ مثال ابھی حال ہی کا ایک واقعہ ہے ایک برطانوی مدبر کو ایک مرتبہ ہٹلر کے ساتھ جرمنی میں کھانا کھانے کا موقع پڑا۔ اتفاق سے برطانوی مدبر کے ہاتھ سے ایک برتن فرش پر گر پڑا۔ برتن کا گرنا تھا کہ کمرہ کے ہر پردہ کے پیچھے سے ہٹلر کے مسلح سیاہ پوش نکل پڑے

ہٹلر، برلن میں ایک بہت بڑے موٹر پر بیٹھ کر نکلتا ہے، برکنز عموماً اس کے پاس بیٹھا ہوتا ہے۔ سیاہ پوش سپاہی اکثر موٹر کے تختوں پر کھڑے رہتے ہیں۔ اگر کسی رسمی موقع پر ہٹلر کو ایسی سڑک سے گزرنا ہوتا ہے جہاں بہت بڑا مجمع ہوتا ہے تو سڑک کے دونوں طرف سیاہ پوش محافظ اس طرح کھڑے رہتے ہیں کہ ایک کا منھ مجمع کی طرف اور دوسرے کا سڑک کی طرف ہوتا ہے

برکنز، کو سیاسی اہمیت بھی حاصل ہے اور وہ یہ کہ برکنز، دوسروں کو ہٹلر سے ملنے کا موقع بہت کم دیتا ہے کہا جاتا ہے کہ ہٹلر کو اکثر اہم مسایل سے بھی ناواقفیت ہے اس لئے کہ اگر اُسے کوئی بہترین مشورہ دینا بھی چاہے تو اُسے ہٹلر سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ کچھ عرصہ ہوا ہٹلر ایک سیاسی مدبر سے ملنے چلا گیا۔ اس مدبر نے ہٹلر کو کچھ ایسی باتیں بتائیں جو اُس نے سنی بھی تھیں۔ ہٹلر ان باتوں کو سن کر بہت حیران ہوا مگر کہا جاتا ہے کہ برکنز دوسرے دن اسی مدبر کے پاس گیا اور اُس کو تنبیہ کی کہ آئندہ ہٹلر سے اس طرح صاف صاف گفتگو نہ کرے

ہٹلر کی قوت کے مظاہر

ہٹلر میں خاص بات اس کے مقصد کا استقلال ہے۔ اس کی حکمت عملی بدل جائے اس کا محاذ جنگ بدل جائے مگر اس کا مقصد و نصب العین وہی رہے گا

اسی کے ساتھ اُس کی قوت تحمل بھی خاص چیز ہے۔ ہٹلر دن دن بھر تقریریں کرنے کے بعد کسی شخص سے گفتگو کرے تو کبھی یہ پتہ نہ چلے گا کہ وہ تھکا ہوا ہے۔ مگر اس کے باوجود اُسے زیادہ محنت کرنے کا شوق نہیں ہے۔ اسکی میز پر کاغذوں کا انبار لگا رہتا ہے اور بعض معاملات ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں اس کے فوری فیصلہ کی ضرورت ہوتی ہے مگر وہ فیصلہ نہیں کرتا۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے فیصلے متضاد و مبہم ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ اپنا کام کر ہی دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ "ڈکٹیٹروں" کے لئے "محنت" کے معنی صرف یہ ہیں کہ پڑھنے اور سننے کی پوری قابلیت رکھتے ہوں چنانچہ ہٹلر اور مسولینی کے وقت کا زیادہ حصہ رپورٹوں کے پڑھنے اور ہر شعبہ کے ماہرین اور ماتحتوں کی اسکیم اور مشورہ سننے میں صرف ہوتا ہے اور باقی وقت اطلاعات حاصل کرنے میں، اسی لئے ایک ڈکٹیٹر کے لئے ضروری ہے کہ وہ آدمیوں کا انتخاب نہایت قابلیت و ہوشیاری سے کرے اور ان کے اندر اپنے ساتھ وفاداری کامل کا

جذبہ پیدا کر دے ——— ہٹلر ان دونوں باتوں میں کامیاب ثابت ہوا ہے

ہٹلر کا احساس سیاسی بہت مکمل ہے اور وہ جو اندازہ لگاتا ہے بہت عاقلانہ ہوتا ہے، چنانچہ اس نے اپنے تین اہم سیاسی فیصلوں کے اعلان کا دن سنیچر کی شام کو اس لئے مقرر کیا تھا کہ دوسرے دن اتوار ہونے کی وجہ سے جبکہ لوگ تفریح میں مشغول ہوں یہ اعلانات زیادہ پریشانی و استعجاب نہ پیدا کر سکیں، وہ تین فیصلے یہ تھے:- جرمنی کی مجلس اقوام سے علٰحدگی، جبریہ فوجی بھرتی، رہائن لینڈ پر قبضہ

جب اُسے کسی ناخوشگوار واقعہ کی تشریح کرنا ہوتی ہے تو وہ عموماً رات کو آٹھ کے بعد تقریر کرتا ہے تاکہ غیر ملکی اخباروں میں اس کی تقریر کا صرف اجمال شایع ہو سکے اور صاف صاف مطلب نہ ظاہر ہونے پائے

ہٹلر اکثر فیصلے، اپنے وجدان سے کرتا ہے اور دو اہم موقعوں پر اس کی یہ نکتہ رسی بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں اس کے پیرووٗں نے اس پر زور دیا کہ وہ انتخاب سے دستبردار ہو جائے، مگر چونکہ اسے یقین تھا کہ وہ قانونی طور پر برسر اقتدار ہو جائے گا اس لئے انکار کر دیا۔ ۱۹۳۲ء کے موسم سرما میں جب نازی جماعت الکشن ہار گئی تو اس کی جماعت کے کچھ لوگوں نے اس سے اصرار کیا کہ وہ اپنی شکست کا اعتراف کرے، ایک تعاونی حکومت قائم کرے مگر ہٹلر نے اس سے بھی انکار کیا اور تین ہی مہینے بعد اُسے وہ غلبہ حاصل ہو گیا جو اس کے متبعین کے وہم و خیال میں بھی نہ تھا

ہٹلر کی قوت کا دوسرا مظہر اس کی غیر خود نمائی ہے۔ مسولینی نے ۱۹۳۲ء سے اسوقت تک ہزاروں آدمیوں کو اپنے دستخطی فوٹو دئے ہوں گے مگر ہٹلر نے جن کو اپنے فوٹو دئے ہیں وہ اُنگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ہٹلر کے متعلق ایک مصنف (Heiden) لکھتا ہے کہ اس کی 'طاقت' اس کی عقل کی وجہ سے ہے مگر ایک دوسرا مصنف اس سے اختلاف کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک 'جذباتی'، و خوش فکر انسان تو کہا جا سکتا ہے مگر اُسے منطقی دماغ کا انسان نہیں کہہ سکتے۔ بقول اسی مصنف کے "اس کی عقل گرگٹ کی طرح ہے جو ہر وقت رنگ بدل سکتا ہے، اور اس کی منطق اس بھوکے شیر کی طرح ہے جو اپنی غذا کی تلاش میں ہو

ہٹلر، کا دماغ بہت محدود، پست خیال اور مذبذب ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے جذبات ریگ میں موتیوں کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں

۱۹۳۵ء میں مسٹر ایڈن وزیر خارجہ دولتِ برطانیہ، ہٹلر سے ملنے گئے اور سات گھنٹے گفتگو کی۔ اس کے بعد انھوں نے باہر آکر شاید یہ کہا کہ ہٹلر کو امور خارجہ پر پورا عبور ہے

ہٹلر کی خطابت

ہٹلر کی قوت خطابت ہی غالباً اس کی ترقی کی سب سے بڑی وجہ ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ اس نے "باتیں کر کر کے" اقتدار حاصل کیا، لیکن تعجب انگیز امر یہ ہے کہ وہ مقرر بھی

اچھا نہیں، وہ تقریر کرتے کرتے چیخ اُٹھتا ہے، اس کا طرز پسندیدہ نہیں ہے، تقریر کے اختتام پر اس کی آواز پھٹ جاتی ہے اور وہ کسی جگہ ٹھہرنا تو جانتا ہی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہٹلر جب کسی مجمع میں بولتا ہے تو انتہائی جوش و خروش پیدا کر دیتا ہے، وہ حاضرین کو اُبھار دینے کا 'گُر' جانتا ہے

ہٹلر کا تشدد ہٹلر بہت تشدد پسند شخص ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اس کا تشدد ہی نازی جماعت کے قیام کا باعث ہوا۔ چنانچہ ۳۰ جون ۳۴ء کو اس نے اپنے دوستوں کا جو قتل عام کیا ہے وہ تاریخ میں اپنی آپ نظیر ہے اور ہٹلر کی سفاکی کا سب سے بڑا ثبوت!

"قائد" کا اصول ہٹلر نے موجودہ سیاسی نظریات میں ایک نئے اُصول کا اضافہ کیا ہے اور وہ یہ کہ 'لیڈر' یا 'قائد' کو ہر حکم دینے کا اختیار ہے اور ماتحت پر اس حکم کی بجا آوری بہر حال فرض ہے۔

اس اُصول سے یہ فایدہ ہوا کہ جماعت کا ہر شخص اپنے آپ کو ایک دوسرے کے ساتھ ایک رشتہ سے منسلک پانے لگا۔ علاوہ اس کے جرمن قوم فطرتاً کسی کے ماتحت رہنا پسند کرتی ہے اور ایک مصنف تو یہاں تک بیان کرتا ہے کہ اُس نے خود جرمن نوجوانوں کو "ہم آزادی پر تھوکتے ہیں" کے نعرہ لگاتے ہوئے سنا ہے۔ اس اُصول کی وجہ سے جرمنی میں بہت سے "چھوٹے چھوٹے لیڈر" پیدا ہو گئے

مخالفت ہر چند 'ہٹلرزم' یا 'ہٹلریت' کا مقصد واقعی جرمنی کو متحد کرنا ہے مگر نازیوں نے ایک طرف کیتھولک پروٹسٹنٹ اور یہودیوں پر سختیاں کر کے ان کو ناراض کر دیا ہے اور دوسری طرف مزدور بھی ان سے خفا ہو گئے ہیں۔ اسی طرح اگر نازی حکومت کسی اقتصادی ترقی کے پروگرام کو سنجیدگی سے پیش کرے تو کارخانہ دار بھی اس سے الگ ہو جائیں گے۔ رہ گئے اشتراکی اور جمہوریت پسند سو وہ نازیوں کی سختی کی وجہ سے پہلے ہی سے مخالف ہیں۔

ہٹلر نے ۳۳ء کے موسم خزاں میں تین اہم مسئلوں پر رائے عامہ حاصل کی، یعنی لیگ آف نیشن سے علٰحدہ ہو جانے کا مسئلہ، جبریہ فوجی بھرتی، اور چنسلری و صدارتِ جرمنی کا ادغام۔ ان تینوں مسئلوں میں ہٹلر کو عظیم الشان اکثریت حاصل ہوئی۔ مگر ڈینزگ کے الکشن میں ہٹلر کو ۲۳۴۹۵۶ ووٹوں میں ۳۴۳۰۹۱۳۹ ووٹ ملے اور ۵ مارچ ۳۳ء کے الکشن میں اُسے صرف ۳۰ فیصدی ووٹ حاصل ہوئے، یعنی ۳۳ء میں مارکسٹ (اشتراکیین و اجتماعیین) ووٹوں کی تعداد ۱۱۸۴۵۰۰۰ تھی۔ بظاہر اب ان مخالفین کی تعداد میں معتدبہ کمی ہو گئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت بھی ہٹلر کے مخالفین موجود ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان مخالفین کی آواز دب کیونکر گئی۔

صورتِ حال یہ ہے کہ اُس کے مخالفین کو ہر طرح سے مرعوب کیا جاتا ہے اور ان کو مختلف قسم کی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ انھیں ہٹلر سے مخالفت کرنے کی صورت میں اپنی جان و مال کا اندیشہ ہے، چنانچہ استصواب رائے کے وقت

انھیں مجبوراً ہٹلر کی موافقت میں 'ہاں' کہنا پڑتا ہے بلکہ بعض تو جان کے خوف سے ہٹلر کی سیاہ پوش فوج میں داخل ہو گئے ہیں۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود وہ اپنا موقع تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں کچھ قوت بھی باقی رہ گئی ہے؟۔ اس کا جواب نفی میں ہے

ہٹلر کے مخالفین کی کمزوری کی وجہ یہ ہے کہ کسی ایسے ملک میں جہاں پولیس کی حکومت ہو مثلاً جرمنی، اٹلی اور فرانس وغیرہ، انقلاب بہت مشکل ہے اور آج کل تو یہ امر مسلم ہو چکا ہے کہ کوئی انقلاب اسوقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک انقلابیوں کے پاس حکومتِ وقت سے زیادہ یا اُس کے برابر، ہتھیار اور سامانِ جنگ نہ ہو۔ جرمنی میں یہ چیز ذرا مشکل معلوم ہوتی ہے۔ اگر جرمنی میں عوام کوئی بلوہ کرنا چاہیں تو ہٹلر کی فوجیں گولیاں چلا چلا کر ان کے سروں کو پاش پاش کر دیں گی۔ مگر اس کے باوجود بہت ممکن ہے کہ خود باہمی تفرقہ اندازی شروع ہو جائے اور ہٹلر کے معاونین ہی میں باہمی مخالفت پیدا ہو جائے اور ایسی صورت میں، حکومت کے لئے چارۂ کار صرف یہ ہو گا کہ وہ اپنے آدمیوں کی توجہ منعطف کرانے کے لئے کسی دوسرے ملک سے جنگ چھیڑ دے اور اس طرح اندرونی خانہ جنگی ختم ہو جائے

ہٹلر کا جانشین

اگر ہٹلر، جلد مر جائے تو اس کا جانشین غالباً گوئرنگ ہو۔ ہٹلر، بذاتِ خود، ممکن ہے کہ اپنے ڈپٹی لیڈر رہس کو اس جگہ کے لئے موزوں تصور کرتا ہو مگر خیال یہ ہے کہ ہٹلر کے بعد گوئرنگ ہی اپنی حکمت عملی کی وجہ سے کامیاب ہو گا اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ جرمن فوج گوئرنگ کو پسند کرتی ہے کیونکہ فوج اور گوئرنگ دونوں کا مقصد ایک ہے

گوئبلس بھی بہت چالاک شخص ہے مگر لوگ اُسے پسند نہیں کرتے۔ اسی طرح اور دوسرے لیڈروں میں بھی کوئی نہ کوئی زبردست کمی پائی جاتی ہے

ایک زمانہ میں یہ خبر اُڑ گئی تھی کہ گوئرنگ، ہٹلر کے خلاف سازش کر رہا ہے مگر اس افواہ میں مطلق صداقت نہ تھی۔ گوئرنگ، ہٹلر کا بڑا وفادار دوست ہے۔ دوسرے اگر گوئرنگ سے مخالفت کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو ہٹلر، اُسے نہایت اطمینان سے اپنے دوست روہم کی طرح قتل کرا سکتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ گوئرنگ وغیرہ ہٹلر کے آفتاب کے سامنے چاند کی طرح ہیں جو چمکتا ضرور ہے مگر صرف اسی وقت جب خود آفتاب اس پر ضَو فگن ہو۔

(باقی)

(نوٹ) آئندہ اشاعت میں ہٹلر اور نازی حکومت کی دوسری خصوصیات پر بحث کی جائے گی

باب الاستفسار

بُت پرستی

(جناب سید اصغر عباس صاحب۔ حیدر آباد)

کیا عبادت کی قدیم ترین صورت جو انسان نے اختیار کی وہ بُت پرستی ہے، میں ممنون ہوں گا اگر آپ اس مسئلہ پر ذرا تفصیل کے ساتھ اظہار خیال فرمائیں ؟

(نگار) بُت پرستی سے مراد ایک ایسے مجسمہ یا مورت کی پرستش کرنا ہے جس کے اندر انسان سے بلند تر ہستی (یعنی کسی دیوتا یا دیوی) نے اپنا مسکن بنا لیا ہو۔ قدیم مذاہب میں بُت پرستی عام طور سے پائی جاتی تھی لیکن یہ کہنا کہ سب سے پہلے انسان نے بُت پرستی ہی کو شعار عبادت قرار دیا، درست نہیں، کیونکہ بعض قدیم ترین وحشی اقوام (مثلاً اسکیمو، ہوٹنٹوٹ، فوجین) میں اسکا پتہ نہیں چلتا حالانکہ مصر، کلدانیہ، ہندوستان، یونان و رومہ کی عظیم الشان تہذیب کے زمانہ میں بُت پرستی بکثرت پائی جاتی تھی

بُت پرستی کے رواج کا سبب غالباً یہ تھا کہ دیوتاؤں کی بلند خلقت کے متعلق انسان قدیم کے جو منتشر و موہوم خیالات تھے ان کو وہ بُت کی مادی و مرئی صورت میں منتقل کر کے اپنے معتقدات و جذبات کے لئے ایک مرکز بنا لیتا تھا بالکل اسی طرح جیسے ایک بچہ گڑیا کو واقعی ایک مستقل ہستی سمجھ کر اس سے باتیں کرتا ہے

یہ خیال کہ بُت پرستی چونکہ خدا کی غیر مادی و منزہ ہستی کو انسان یا جانور کی شکل میں دیکھنے پر اصرار کرتی ہے اس لئے وہ مذہب کی انحطاطی صورت ہے درست نہیں بلکہ برخلاف اسکے مذہب کی اُس ابتدائی صورت کی ترقی یافتہ صورت ہے جب انسان اپنے مذہبی خیالات کو کوئی ممیز و متعین صورت بھی نہ دے سکتا تھا۔ مذہب کی اولین بنیاد اسوقت پڑی جب انسان نے مظاہر فطرت کے سمجھنے کی کوشش کی اور جب وہ انکی کوئی تعلیل و توجیہ نہ کر سکا تو بیم و رجا کے جذبات اس میں پیدا ہوئے۔ اور ان کو اپنے سے بلند غیر معلوم ہستیوں کا کارنامہ سمجھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے بعد اس کو جب یقین ہو گیا کہ ایسی ہستیاں ضرور پائی جاتی ہیں تو پھر وہ ان کا تصور کرنے لگا اور اسی تصور نے آخر کار اسے مختلف شکلوں کے بُت بنانے پر مائل کیا۔ اس لئے یہ کہنا کہ

بُت پرستی مذہب کی انحطاطی منزل ہے، خلافِ حقیقت ہے، بلکہ دراصل اسے قدیم انسان کے قدیم مذہب کی ترقی یافتہ صورت کہنا چاہئے۔ ان مذاہب کے نزدیک جو توحید کے قایل ہیں، بُت پرستی سے مراد صرف پتھروں کا پوجنا نہیں ہے بلکہ درختوں، جانوروں سیاروں اور مُردوں کی پرستش سب داخل بُت پرستی سمجھی جاتی ہے۔ بت پرستی کی اولین صورتوں میں ایک تو یہ تھی کہ انسان اپنے معبود کو مجسم صورت میں منتقل کر دیتا تھا اور دوسرے یہ کہ وہ ایسی ارواح کا معتقد تھا جو انسانی کاروبار پر موثر ہوتی ہیں۔ وہ یہ بھی یقین کرتا تھا کہ بعض ایسی طلسمی چیزیں بھی موجود ہیں جن کو پاس رکھنے سے ان چیزوں سے متعلق ہونے والی روحیں مدد کرتی ہیں۔ اول اول ایسی چیزیں لکڑی اور پتھر ہی سمجھی جاتی تھیں اور چونکہ ان کو آسانی سے تراش کر کسی نہ کسی صورت میں بدلا جا سکتا تھا اس لئے یہ طلسمی چیزیں آہستہ آہستہ بتوں اور مجسموں میں تبدیل ہو گئیں اور پھر رفتہ رفتہ انمیں آرائش و زیبایش پیدا کر کے ان کی مختلف صورتیں پیدا کی گئیں

لامائیت

(جناب چودھری عتیق الرحمان صاحب۔ مبارکپور)

میں لاما مذہب کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ براہ کرم مختصراً بیان فرمایئے۔

(نگار) لفظ لاما کے معنے روحانی معلم و آقا کے ہیں اور تبت و منگولیا میں جو مذہب رائج ہے اسے مذہب لاما یا لامائیت کہتے ہیں اس مذہب کی بنیاد حقیقتاً بودھ مت ہے۔ لیکن بعد کو شیو پرستی سے ملکر اسکی صورت بدل گئی۔ قدیم بودھ مذہب میں خدا کی پرستش کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اگر ان کے یہاں پرستش تھی تو صرف بڑے بڑے مقدس لوگوں کی، چنانچہ یہ دوسری خصوصیت لاما مذہب میں بھی پائی جاتی ہے — اس مذہب کی تشکیل تین چیزوں سے ہے۔ ایک یہ کہ بودھ کو سب سے بڑا مقدس رہنما سمجھا جائے۔ دوسرے یہ کہ بودھ اب بھی مختلف ہستیوں میں جلوہ گر نظر آتا ہے اور تیسری چیز جسے نظام مذہب کہنا چاہئے پجاری جماعت ہے جس میں وہ افراد بھی شامل ہیں جن میں بودھ نے حلول کیا اور وہ بھی جو اس شرف سے محروم ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ ان کے معتقدات ہندوؤں سے بھی ملتے جلتے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ انکی طرح یہ بھی اندر، یام اور شیو کی پرستش کرتے ہیں۔ پرستش کا طریقہ یہ ہے کہ بہت سی دعائیں گا گا کر پڑھی جاتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ڈھول اور قرنا وغیرہ بجا کر مختلف قسم کی ہولناک آوازیں پیدا کی جاتی ہیں — عبادت کے وقت (جو دن میں تین بار ہوتی ہے) پہلے گھنٹی بجائی جاتی ہے، اس کے بعد تمام پجاری ایک یا دو قطاروں میں درجہ بدرجہ آکر بیٹھ جاتے ہیں اور پوجا شروع ہو جاتی ہے۔ بعض تقریبات میں مندر بہت آراستہ کئے جاتے ہیں اور قربانگاہ پر دودھ، مکھن، چاء، آٹا وغیرہ چڑھائے جاتے ہیں

جانور کی قربانی بالکل نہیں ہوتی کیونکہ بودھ نے کسی جانور کو ستانا کبھی گوارا نہ کیا تھا۔ مرنے کے بعد بڑے بڑے لوگ جلادئے جاتے ہیں اور معمولی لوگوں کی لاشیں کھلے میدانوں میں رکھدی جاتی ہیں جہاں جانور انھیں کھا جاتے ہیں۔ ان کے پجاریوں میں دو بڑے زبردست پجاری تسلیم کئے جاتے ہیں، ایک کا نام دلائی لاما (یعنی سمندر کی طرح وسعت رکھنے والا) ہے۔ یہ لہاسا کے پاس پوتالا میں رہتا ہے اور دوسرا تاشی لاما جو تاشی لونپو کے مندر میں (مقام شگالٹی کے قریب) رہتا ہے۔ اصولاً یہ دونوں لاما ایک ہی مرتبہ کے سمجھے جاتے ہیں اور دونوں کا اقتدار برابر ہے لیکن دلائی لاما کا رقبۂ اثر زیادہ وسیع ہے۔ ان دو کے بعد اُن پوجاریوں کا درجہ ہے جو ہوبلغان کہلاتے ہیں ان کی تعداد بہت ہے اور دلائی لاما اور تاشی لاما کی طرح انکے اندر بھی بودھ مذہب کے رشیوں کی روح کام کرتی ہوئی تسلیم کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دلائی لاما اور تاشی لاما میں چودھویں صدی کے ایک مشہور لامائی رفارمر کی روح پائی جاتی ہو اور دوسرے پوجاریوں میں دوسرے رفارمروں کی ـــ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ مرنے والے لاما کی روح کس شخص کے اندر حلول کرنے والی ہو مختلف ذریعے اختیار کئے جاتے ہیں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مرنے والا لاما خود بسترِ مرگ پر اپنے حواریین کو بتا دیتا ہے کہ وہ کہاں کس خاندان میں دوبارہ رونما ہوگا یا کوئی وصیت اس قسم کی چھوڑ جاتا ہے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لاما کے مرنے پر مقدس کتابوں کی چھان بین کی جاتی ہے اور مذہبی نجومیوں سے دریافت کیا جاتا ہے اور جب تک اس کا پتہ نہیں چلتا، تاشی لاما اس کی خدمات انجام دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس باب میں دربار پیکنگ کے انتخاب کو بہت اہمیت دیجاتی ہے ـــ علاوہ ان تین قسم کے پجاریوں کے اور بہت سے پجاری ادنیٰ درجہ کے بھی ہوتے ہیں جن کے اندر کوئی مقدس روح حلول نہیں کرتی اور جن کا مرتبہ ان کے مذہبی معلومات کے لحاظ سے متعین کیا جاتا ہے۔ بلعموم ان کے چار درجے ہوتے ہیں پہلا ان نوعمر لڑکوں کا، جو عموماً چھٹے ساتویں یا نویں سال مندر میں مذہبی تعلیم کے لئے بھیجدئے جاتے ہیں، دوسرا درجہ نائب پجاری کا ہے، تیسرا مذہبی گداگروں کا اور چوتھا معلم مذہبی کا۔ ان سب کا فرض ہے کہ وہ ترکِ دنیا کا حلف اُٹھائیں اور ان میں سے اکثر خانقاہوں اور مندروں میں زندگی بسر کرتے ہیں ـــ ان کے خانقاہوں کی صورت یہ ہوتی ہے کہ درمیان میں مندر رہتا ہو اور اس سے ملحق اور متعدد عمارتیں ہوتی ہیں جو پوجاریوں کی بود و باش و تعلیم اور کتب خانہ وغیرہ کا کام دیتی ہیں۔ خانقاہ کا انتظام ایک سردار پوجاری کے سپرد ہوتا ہو جسکا انتخاب براہ راست دلائی لاما کرتا ہو یا کوئی اور اسکا ماتحت پجاری جو اس صوبہ یا شہر کا انچارج ہے۔

مردوں کی طرح عورتیں بھی اپنی زندگی خانقاہ کے لئے وقف کر سکتی ہیں اور انکے قیام کے لئے بھی علٰحدہ عمارتیں ہوتی ہیں۔

انکی مقدس کتاب کا نام کندجور ہے جس سے مراد "الفاظ بودھ کا ترجمہ" ہے۔ یہ تقریباً دو ہزار ابواب میں منقسم ہے اور ۱۰۸ جلدوں میں تمام ہوتی ہے۔ اسوقت تک سو سے زیادہ لاما گزر چکے ہیں۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں جو لاما پایا جاتا تھا وہ انگریزوں کا دشمن ہوگیا تھا۔ جب انگریزی فوج بھیجی گئی تو وہ بھاگ کر لہاسا چلا گیا۔ بعد کو از روئے معاہدہ اس کی جگہ تاشی لاما کو دی گئی جو سنہ ۱۹۰۶ء میں پرنس آف ویلز سے ملنے کلکتہ آیا تھا۔

میں کہاں ہوں؟

کہاں وہ دمبدم رنگِ ہجوم جلوہ آرائی،
کہاں یہ رات؟ کالی رات اور فرقت کی تنہائی

کہاں نیچی نگاہوں میں، دلِ بے تاب کی پرسش
پھڑک کر حال کہنے، بارہا ہونٹوں پر جان آئی

کہاں یہ زندگی میری، سکونِ موت کی صورت
لبِ خاموش میں گم ہوگئی ہے تابِ گویائی

سُن اے پاسِ ادب، جانِ حزیں پر کھیل جانے دے
مجھے منظور کب ہے دشمنوں کی ان کے رسوائی

نفس کا تار ٹوٹے تو مزا آجائے کچھ دل کو
کریا دآنے لگی ہے اب کسی کی مجھ کو انگڑائی

نقابِ دوریٔ رہ تم اُٹھا دو حُسنِ منزل سے
مسافر کو جو مایوسی کی نیند آئی تو موت آئی،

میں شکلِ دلبری کو کیا کہوں؟ کچھ کہہ نہیں سکتا
متانت اور اس پر حُسن بھی، سیرت میں جان آئی

میں اُن سے دور رہ کر اور شکلِ زندگی دیکھوں؟
کہاں اتنی سکون و صبر کی آنکھوں میں بینائی

وہ شب کا جاگنا دو دو پہر تک رنگ لایا ہے
بجائے خواب، اشکِ گرم سے اب آنکھ بھر آئی

محبت میں تمیزِ این و آں، یہ خوب فرمایا
گریباں اور دامن کو کہیں سمجھا ہے سودائی

تمھیں اور میں نہ چاہوں؟ حشر تک تو یہ نہ چاہونگا
مجھے منظور ہے دونوں جہاں میں اپنی رسوائی

میں یوں ظرفِ زمانہ کی نزاکت کو سمجھتا ہوں
بھرا شیشے میں ہے یعنی مزاجِ تندِ صہبائی

اسی نے مجھ کو دل بخشا، اسی نے بیقراری دی
عطا جس نے کیا ہے تم کو حُسنِ نازِ زیبائی

ہمارا اور تمھارا بس اسی پر فیصلہ ٹھہرے
نہ تم کو رنجِ رسوائی، نہ مجھ کو زعمِ رسوائی

فلک کی گردشوں نے دور پھینکا، اس سے کیا حاصل!
زمیں ہوگی تمھاری یاد میں خاکِ جبیں سائی

یہ دل ہے، تنگ کچھ پابندیوں سے ہو نہیں سکتا
ہماری آبلہ پائی ہے، شوقِ دشت پیمائی

مشامِ جانِ دل، بے خود پئے تشبیہ گیسو ہے
گھٹا آئی تو کیا آئی؟ ہوا لائی تو کیا لائی؟

جہاں آباد کی رونق، متاعِ ذوقِ بنیش ہے
مگر سب سے جدا ہے اسکے جلوے کا تماشائی،

تمھاری پاے بندی کو دلِ وحشی سمجھتا ہے
سمو سکتی نہیں ہو حسنِ گل، بلبل کی بینائی

بیانِ دردِ غم کی تم حقیقت کھیل سمجھے تھے
مرے آئینۂ رخ میں کوئی صورت نظر آئی؟

مرے دل میں، نگاہوں میں، تمنا میں، امیدوں میں
تو از ہر در کہ باز آئی بہ آں خوبی و زیبائی

پرستاری کی عادت ہوگئی ہے عشقِ رسوا کو
مجھے تو پوجنا ہے، ہو کسی صورت میں رعنائی

شبِ فرقت کی گھڑیاں، میرے کاٹے سے نہیں کٹتیں
اجل ایسے میں آجائے تو میں سمجھوں مسیحائی

ہے تجھ سے دور لیکن دیکھتا ہے ہر طرف تجھ کو
ترا کیفی تمنائی، سراپا ناشکیبائی

کیفی چریاکوٹی

غزل

میں ہوں، دل ہے، غمِ نہانی ہے
وہ ہیں، آئینہ ہے، جوانی ہے

دعوتِ جلوہ عام ہے - یعنے
میرے مرنے کی شادمانی ہے

ساعتیں چند نامرادی کی،
بس یہی شرحِ زندگانی ہے

دل میں ہے کچھ سکون سا شاید
آمدِ مرگِ ناگہانی ہے

دورِ صہبا ہے، میں ہوں، اور ساقی
اک سلیقہ کی زندگانی ہے

رازِ ہستی کسی کو کیا معلوم
موت ہے یہ کہ زندگانی ہے

کس قدر سادہ دل ہے مرغِ چمن
کوئی کہدے بہارِ ثانی ہے

ذرہ ذرہ ہے روکشِ مینا،
میرے ساقی کی مہربانی ہے

ہوش کو کوچہ گرد رہنے دو
کیا کیا جائے نوجوانی[1] ہے

ہوش بلگرامی

[1] ۲۰ سال قبل کی باتیں ہیں۔

باب ہفتم

غوریوں کا خروج

خاندانِ غزنی کے فرمانرواؤں نے ہرچند ہندوستان پر متعدد حملے کئے اور ایک معقول حصۂ زمین پر اپنے شاہانہ اثرات قایم کرلئے، لیکن اُنھوں نے سرزمینِ ہند کو کوئی مستقل سلطنت نہیں بنایا، بلکہ اُس کی حیثیت صرف ایک صوبہ کی سی رہی جو حکومتِ غزنی سے متعلق سمجھا جاتا تھا۔ ہرچند محمود غزنوی یا اُس کے بعد بعض سلاطین کے لئے ہندوستان کو مرکزِ حکومت بنالینا دشوار نہ تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اِسوقت وسطِ ایشیا کی اہمیت بہت زیادہ تھی اور ایک ایسے خاندان کے لئے جو اپنے مذہب، اپنے مرز و بوم، اپنے امیال و عواطف کے لحاظ سے ایران اور روس کے قرب و جوار میں زیادہ اسباب دلچسپی رکھتا تھا۔ مشرق کے ایک دور دراز ملک کو اپنا حقیقی جولانگاہ قرار دینا دشوار تھا پھر چونکہ ہندوستان ایک بہت وسیع ملک ہے اور اُس پر اقتدار سلطنت قایم رکھنے کے لئے پوری توجہ کی ضرورت ہے اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ اگر سرزمینِ ہند کے حصول ہی کو اصل مقصود قرار دے لیا گیا تو وسطِ ایشیا کی طرف پھیلی ہوئی قوت کا ضعیف ہوجانا یقینی ہے اور یہ انھیں گوارا نہ تھا۔ علاوہ اس کے محمود نے غزنی کو "عروس البلاد" بنانے میں ایسی معمولی محنت صرف نہ کی تھی کہ وہ اس کو اُجڑتا ہوا دیکھنا پسند کرتا اور وہاں کی رونق و شوکت کو ہندوستان کی آرایش پر قربان کردیتا۔ علی الخصوص ایسی حالت میں جبکہ یہاں کی آب و ہوا بھی ان سرد ملکو میں زندگی بسر کرنے والوں کے لئے زیادہ دلچسپ و خوشگوار نہ تھی

الغرض شمالی ہندوستان کو، غزنوی حکومت کے ماتحت ایک صوبہ کی سی حیثیت اختیار کئے ہوئے دو صدی کا زمانہ گزر چکا تھا کہ زمانہ کے سیلاب نے ایک دوسری موج بلند کی اور وہ نقش و نگار جو پہلی موج نے غزنی میں قایم کئے تھے

مٹنے لگے

تاریخ عہدِ غزنوی کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے بڑا خطرہ جس نے فرمانروایانِ غزنی کو سراسیمہ بنا رکھا تھا سلجوقیوں کا تھا لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ آخر وقت تک غزنوی بادشاہوں کو یہ نہ معلوم ہوا کہ اُن کو تباہ کرنے والا سیلاب خود اُنھیں کے اندر پرورش پا رہا ہے

غزنی اور ہرات کے درمیان غور کی پہاڑیوں میں ایک قلعہ فیروزکوہ کے نام سے مشہور تھا اور اس سنگستانی علاقہ میں عرصہ سے ایک جری افغانی قوم آباد تھی اور قلعۂ فیروزکوہ میں خاندانِ شور اس کا حکمراں تھا

۴۰۱ھ/۱۰۱۰ء میں محمود غزنوی نے محمد بن سوری حاکم غور کو زیر کیا (جس نے خودکشی کر لی) اور اسی خاندان کے ایک فرد کو وہاں کا حاکم مقرر کر کے غورستان کو اپنا باجگذار بنا لیا [1]

جب تک محمود زندہ رہا غورستان نہ صرف مطیع رہا بلکہ اُس نے بہت سے بہادر اور قابل سپاہی بھی محمود کی فوج کے لئے مہیا کئے لیکن محمود کے بعد جانشینانِ محمود کی کمزوری کی وجہ سے غورستان پر وہ تسلط قایم نہ رہ سکا اور رفتہ رفتہ اس میں ضعف پیدا ہونے لگا

سلطان بہرام شاہ (غزنوی) کے عہد میں قطب الدین محمد غوری (جو سلطان بہرام شاہ کا داماد بھی تھا) غورستان کا حاکم تھا۔ چونکہ قطب الدین درپردہ غزنی کی تسخیر کا اہتمام کر رہا تھا اس لئے بہرام شاہ نے اُس کو غزنی بلایا اور ہلاک کرا دیا۔ اسکا بھائی سیف الدین بھی ساتھ تھا۔ یہ بھاگ کر غور پہونچا اور وہاں سے فوج فراہم کر کے غزنی پر حملہ کیا اور قبضہ کر لیا۔ چنانچہ بہرام شاہ کو غزنی سے بھاگ کر کرمان میں پناہ لینی پڑی۔ جب جاڑے کا زمانہ آیا تو پھر بہرام شاہ نے غزنی واپس لینے کی کوشش کی اور کثیر فوج کے ساتھ سیف الدین پر حملہ کر دیا۔ لیکن قبل اس کے کہ سیف الدین مقابلہ میں آتا اہلِ غزنی نے اس کو گرفتار کر کے بہرام شاہ کے پاس بھیجدیا۔ بہرام نے اس کو قتل کرا دیا۔ اس کی خبر دوسرے بھائی علاء الدین کو معلوم ہوئی جو اُس وقت غور میں تھا وہ ایک جرار لشکر لے کر غزنی پہونچا اور اس نے قتل عام کر کے سارے غزنی میں آگ لگا دی اور "جہانسوز" کے لقب سے مشہور ہوا [2]

اسوقت ہندوستان کے حالات اس کے مقتضی تھے کہ یہاں پھر تاخت کا سلسلہ شروع ہو جائے۔ کیونکہ ایک صدی سے زائد زمانہ گزر چکا تھا کہ کہیں نہ کہیں شورش و ہنگامہ برپا رہتا تھا اور غزنی خاندان کے آخری فرمانرواؤں نے پنجاب کو بہت کچھ اُس کے حال پر چھوڑ رکھا تھا اور یہ کہنا غالباً نادرست نہ ہوگا کہ ہندو فوج اور ہندو سرداروں نے انھیں بہت کچھ ہندوستانی بنا لیا تھا

---

[1] حبیب السیر۔ جلد ۴۔ صفحہ ۱۷۴ - [2] فرشتہ جلد اول (نولکشور) صفحہ ۵۵-۵۶ -

خسرو شاہ (بہرام کے بیٹے) نے اس امر کی کوشش کی کہ وہ افغانستان کی حکومت پر پھر قابض ہو جائے لیکن غزنی تباہ و برباد ہو چکا تھا، دوسرے مقامات میں بدامنی پھیل رہی تھی اور غز ترکوں کی جماعتیں ہر جگہ چھائی ہوئی تھیں ہر چند علاء الدین جہانسوز غزنی کو تباہ و برباد کر چکا تھا اور اگر وہ چاہتا تو اسی وقت پنجاب کو بھی فتح کر لیتا لیکن وہ اپنے قلعۂ فیروز کوہ پر قانع تھا اور اُس نے کوئی پیشقدمی نہیں کی۔ جب ۵۵۶ھ ۱۱۶۱ء میں اس کا انتقال ہوا تو اُسکا بیٹا سیف الدین غورستان کا فرمانروا ہوا، لیکن اُس نے بھی ہندوستان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ دو برس بعد جب اس کا بھی انتقال ہو گیا، تو ۵۵۸ھ ۱۱۶۳ء میں علاء الدین کا بھتیجا غیاث الدین فرمانروا ہوا۔ اس وقت غزنی پر اتراکِ غز قابض ہو چکے تھے۔ غیاث الدین بہت منچلا شخص تھا اس لئے غورستان کی افغان جماعت میں اُس نے پھر نئی روح پھونکی اور آخر کار ۵۶۹ھ ۱۱۷۳ء میں (جب کہ غزنی پر غز ترکوں کی حکومت کو دس سال سے زاید نہ ہوئے تھے) اُس نے غزنی کو فتح کرکے اپنے بھائی معز الدین کو جسے شہاب الدین اور محمد غوری بھی کہتے ہیں وہاں کا گورنر متعین کر دیا۔ گویا ان دونوں بھائیوں میں حکومت تقسیم ہو گئی یعنی غیاث الدین فیروز کوہ میں رہا اور معز الدین غزنی میں حکومت کرنے لگا

ہندوستان کی تاریخِ اسلام میں معز الدین (یا شہاب الدین محمد غوری) کو جو درجہ حاصل ہے وہ مشکل سے کسی دوسرے فرمانروا کو حاصل ہو سکتا ہے، کیونکہ پہلا شخص جس نے ہندوستان کے اندر بیرونی حکومت کی مستحکم بنیاد قایم کی، یہی تھا۔ اس سے دو صدی قبل جس طرح محمود نے مسلسل تیتیس سال تک ہندوستان کو اپنے قشونِ قاہرہ کا جولانگاہ بنائے رکھا، بالکل اسی طرح شہاب الدین نے بھی تقریباً تیس سال تک اپنے عزمِ ملوکانہ کا ڈنکہ سارے ہندوستان میں بجایا۔ لیکن فرق یہ ہے کہ محمود نے غزنی پر ہندوستان کو قربان کر دیا اور شہاب الدین نے عروسِ ہند کے لئے سارے وسطِ ایشیا سے منھ موڑ لیا

غزنی اور ہندوستان کا باہمی تعلق

شہاب الدین غوری کی ہندوستان میں

شہاب الدین محمد غوری

ہندوستان کا اولین مسلمان فرمانروا

۵۸۹-۶۰۲ھ
۱۱۹۳-۱۲۰۵ء

شہاب الدین غوری کے اقدامات ہند

شہاب الدین کا اولین مقصود یہ تھا کہ وہ ہندوستان کے تمام اسلامی مقبوضات کو اپنے اقتدار میں لاکر ایک مرکز سے منسلک کر دے چنانچہ اُس نے سب سے پہلے دریائے سندھ کی طرف اقدام کیا اور ۵۷۱ھ ۱۱۷۵ء میں

ملتان کو فتح کر کے قرامطہ[1] کو وہاں سے نکالدیا۔ اس کے بعد وہ انھلواڑہ گیا اور ۵۷۷ھ[2] تک سارا سندھ، دیبل تک اُس نے فتح کر لیا۔ اسی اثنار میں اُس کی افواج نے پشاور بھی لے لیا اور خسرو ملک غزنوی خاندان کے آخری فرمانروا نے (جو اپنی کمزوری کی وجہ سے لاہور میں جان بچائے پڑا ہوا تھا) اپنا کمسن لڑکا معہ دیگر تحایف کے پیش کر کے تھوڑے دنوں کے لئے امن وسکون خرید لیا

اس کے بعد پھر ۵۸۲ھ میں شہاب الدین نے لاہور پر حملہ کیا اور دوسرے سال خسرو ملک کو قید کر کے فیروزکوہ کی طرف بھیجدیا جہاں وہ پانچ سال کے بعد معہ اپنے بیٹے کے قتل کر دیا گیا

اب شہاب الدین اپنے مسلمان رقیبوں کی طرف سے بالکل مطمئن ہو گیا اور ہندوؤں کی طرف متوجہ ہوا۔ اس سے قبل ہندو مسلمانوں کے تعلقات اسقدر بڑھ چکے تھے کہ تمام محکموں (یہاں تک کہ فوج میں بھی) ہندو بہ کثرت نظر آتے تھے لیکن اب یہ پالیسی ترک کر دی گئی اور حملہ آوروں میں سوائے ترکوں اور افغانوں کے کوئی تیسرا عنصر شامل نہیں کیا گیا

شہاب الدین نے سب سے پہلے قلعۂ سرہند پر حملہ کیا اور اس حملہ نے ہندوستان کے تمام راجپوتوں میں ایسی آگ مشتعل کر دی، کہ سب کے سب پرتھی راج فرمانروائے اجمیر (چوہان راجپوتوں کے سردار) کے ساتھ شامل ہو گئے اور شہاب الدین کے مقابلہ پر اپنی تمام قوتیں صرف کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ دونوں طرف جوش اپنا اپنا کام کر رہا تھا، غیظ وغضب، غیرت وخودداری کے جذبات انتہائی نقطۂ عروج پر پہونچ چکے تھے، کہ ۵۸۷ھ میں کرنال سے دس میل کے فاصلہ پر بمقام ترائن (اُسی میدان پانی پت کے ایک حصہ پر جہاں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ بارہا ہوا اور ہونے والا تھا) دونوں فوجیں ایک دوسرے سے متصادم ہوئیں۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان افواج نے حد درجہ بہادری سے کام لیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ راجپوتوں کا جوش بہت بڑھا ہوا تھا اور اُنھوں نے اسقدر باقاعدہ صف بندی کے ساتھ مقابلہ کیا کہ شہاب الدین اپنے میمنہ ومیسرہ سے جدا ہو کر دشمنوں میں گھر گیا۔ یہ ایسا وقت تھا کہ جری سے جری انسان کو بھی بدحواس ہو جانا چاہیئے تھا، لیکن شہاب الدین مطلق مضطرب نہیں ہوا۔ اُس نے تنہا پرتھی راج کے بھائی (رائے دہلی) پر، جو ایک زبردست ہاتھی پر میٹھا ہوا تھا، اپنے خار اشگاف نیزہ سے ایسا سخت حملہ کیا کہ اُس کے دانت ٹوٹ کر حلق میں چلے گئے۔ قریب تھا کہ شہاب الدین کے بھی دہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دئے جاتے اور زخم کھا کر وہ اپنے گھوڑے سے نیچے گر جاتا، لیکن اتفاق سے ایک خلجی سپاہی نے دیکھ لیا اور فوراً شہاب الدین کے پیچھے اُسکے

---

[1] اس سے قبل محمود بھی ان قرامطہ کو ملتان سے نکال چکا تھا جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ پھر بعد کو یہاں قابض ہو گئے تھے

[2] یہ سنہ طبقات ناصری کا ہے دیگر مورخین میں اختلاف ہے بعض ۵۸۶ھ ظاہر کرتے ہیں اور بعض ۵۸۸ھ۔

گھوڑے پر سوار ہو کر میدان سے بچا کر نکل گیا۔ اس واقعہ سے مسلمان افواج کے قدم اکھڑ گئے اور شہاب الدین غزنی چلا آیا

شہاب الدین کا دوسرا حملہ اور پرتھی راج کا قتل

شہاب الدین کو اس شکست کا جسقدر رنج ہوا وہ اس سے ظاہر ہے کہ خواب و خور اُس پر حرام ہو گیا تھا اور ایک سال کا انتظار بھی اُسے شاق تھا۔ آخر کار دوسرے سال اُس نے ایک لاکھ بیس ہزار کی جمعیت سے جس میں افغان، ترک اور ایرانی شامل تھے پھر ہندوستان پر حملہ کیا (اس اثنا میں پرتھی راج ایک سال کے محاصرہ کے بعد سرہند پر قابض ہو گیا تھا اور نرائین کے میدان میں شہاب الدین کا منتظر تھا)

شہاب الدین کو اس سے قبل چونکہ نہایت تلخ تجربہ حاصل ہو چکا تھا اس لئے اس مرتبہ اُس نے لڑائی کا رنگ ہی بدل دیا اور سواروں کو چار حصوں میں تقسیم کر کے چاروں طرف سے راجپوتوں پر ایسا سخت حملہ کیا کہ اُن میں انتشار پیدا ہونے لگا۔ عین اُسی وقت اُس نے ایک چال اور یہ کی کہ اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ جب راجپوت حملہ کریں تو پسپائی کا اظہار کر کے اُن میں زیادہ انتشار پیدا کر دیا جائے اور پھر پلٹ کر حملہ کیا جائے۔ اس ترکیب سے ہندو افواج بہت جلد تھک کر عاجز آگئیں اور آخر کار اُنھیں ایسی شکست اُٹھانی پڑی کہ مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ بہت سے راجپوت سردار مارے گئے اور پرتھی راج بھی جو ایک گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ گیا تھا سرستی کے قریب گرفتار ہو کر قتل کر دیا گیا (۵۸۸ھ / ۱۱۹۲ء)

اس کامیابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اجمیر، ہانسی اور سرستی پر شہاب الدین کا قبضہ ہو گیا۔ چنانچہ شہاب الدین نے اجمیر میں وہیں کے راجہ کے لڑکے کو حاکم مقرر کیا اور اپنے غلام قطب الدین ایبک کو ہندوستانی مقبوضات کا وائسرائے بنا دیا

قطب الدین ایبک کے کارنامے

چونکہ قطب الدین ایبک خود بے انتہا جری شخص تھا اس لئے اُس نے صرف اسی پر کفایت نہیں کی بلکہ میرٹھ، دہلی اور علیگڈھ کو بھی فتح کر کے اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا اور دوسرے سال خود شہاب الدین نے راجہ قنوج کے خلاف فوجکشی کی۔ چنانچہ چھندواڑہ اور اٹاوہ کے درمیان ساحلِ جمن پر مقابلہ ہوا اور راٹھور راجپوتوں کو سخت شکست ہوئی۔ اب نہ صرف قنوج اور بنارس پر قبضہ ہو گیا تھا بلکہ گوالیار، بدایوں، کالپی، کالنجر، بیانہ یعنی تمام "شمالی ہندوستان" کو بھی قطب الدین نے فتح کر لیا تھا

بختیار خلجی کی فتوحات

یہ حال تھا دوآبہ اور اُس کے اطراف و جوانب کا، لیکن دوسری طرف محمد بختیار خلجی نے (شہاب الدین کا دوسرا غلام) اودھ اور لکھنوتی کی طرف (جو بنگال کا دارالحکومت تھا) بڑھ کر ۵۹۳ھ / ۱۱۹۷ء میں بہار و بنگال پر قبضہ کر لیا اور اس طرح ہندوستان کا انتہائی "مشرقی حصہ" بھی مسلمانوں کے اقتدار میں آگیا

غوری سلطنت کا تنزل

اگر شہاب الدین صرف ہندوستان کے مقبوضات پر قانع رہتا تو بھی کم نہ تھا، لیکن وہ اپنے مرز بوم کی طرف سے بھی غافل نہ تھا، اس لئے اُس نے

خوارزم[1] (موجودہ خیوا) پر بھی حملہ کیا۔ جہاں اُسے سخت شکست ہوئی۔ (۵۹۹ھ/۱۲۰۲ء)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری سلطنت میں بغاوت رونما ہوئی۔ ملتان نے اپنا فرمانروا الگ منتخب کر لیا۔ غزنی نے اپنے دروازے اس کی مخالفت میں بند کر لئے، گکھروں نے لاہور پر قبضہ کر کے پنجاب کو تباہ کرنا شروع کیا اور سلطنت غور کے تمام پُرزے ڈھیلے ہوگئے

شہاب الدین کی ہمت و جرأت کی آزمائش کا یہ دوسرا موقعہ تھا اور یہ اس میں بھی کامیاب ثابت ہوا اور بدقت تمام پھر ملتان و غزنی پر قابض ہو کر گکھروں کے فتنہ کو دبایا، لیکن یہ استیصال بالکل عارضی تھا اور گکھر جماعت اُسکے خون کی پیاسی تھی اس لئے ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء میں غرۂ شعبان کی تیسری کو اُنھوں نے بزدلانہ طریقہ سے اس کے خیمہ میں جا کر قتل کر دیا اور آخر کار حکومتِ ہندوستان کا تعلق ہندوستان ہی سے رہ گیا اور قطب الدین ایبک اُسکے جانشین نے صحیح معنی میں اولین فرمانروائے ہند ہونے کا فخر حاصل کیا

شہاب الدین غوری نہ صرف جری، فراخ حوصلہ اور مستقل مزاج شخص تھا بلکہ اسی کے ساتھ وہ بے انتہا ضابط و متحمل بھی تھا۔ باوجود اس کے کہ اس کو نہایت سخت مصائب کا سامنا پڑا اور راجگانِ ہند نے اُسے اکثر حد درجہ مشتعل و غضب آلود کر دیا لیکن میدان جنگ میں اُس نے کبھی اُس بیجا ظلم و ستم سے کام نہیں لیا جو وحشی و ناشائستہ قوموں کا شعار ہے یا جسے اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے

ہندوستان کے نہایت سخت معرکوں میں وہ معرکہ بھی تھا جو راجہ بنارس اور شہاب الدین محمد غوری کے درمیان پیش آیا لیکن حسب بیان کامل ابن اثیر[2] معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے باوجود شدتِ غیظ کے دوران جنگ میں، اور باوجود فاتح ہونے کے جنگ کے بعد، ایک عورت اور بچہ پر بھی ہاتھ نہیں اُٹھایا کیونکہ شہاب الدین محمد غوری کبھی جبر و ظلم یا

---

[1] خوارزم، بحر خضر کے شرقی جانب کا حصۂ ملک۔ اس کا پایۂ تخت گرگان تھا۔ عربوں نے اس حصۂ زمین کا نام جرجانیہ رکھ لیا اور پایۂ تخت کو جرجانیہ کہنے لگے۔ عہدِ سلاجقہ میں ملک شاہ سلجوقی کا ایک غلام نوشتگین یہاں کا حاکم ہوا تھا اُس نے خود مختار بن جانے کی کوشش کی۔ اُس کے بیٹے قطب الدین نے ملک کو اور وسعت دیکر خوارزم کا لقب اختیار کیا کیونکہ قبل حکومت اسلام یہاں کے فرمانروا خوارزم کے نام سے مشہور تھے۔ اس خاندان نے بعد کو بہت ترقی کی اور زوالِ سلاجقہ پر اس خاندان (خوارزم شاہی) کے عروج کی تاریخ قائم ہوئی۔ خوارزمی سلطنت بحر خضر سے دریائے سندھ تک اور خلیج فارس سے سیحون تک وسیع تھی۔ یہ سلطنت ۱۳۸ سال تک قائم رہی (۴۹۱ھ/۱۰۹۷ء سے ۶۲۸ھ/۱۲۳۵ء تک) اسکے آخری فرمانروا جلال الدین کو چنگیز خاں نے ۶۱۸ھ میں دریائے سندھ سے باہر کر دیا اور دس سال بعد عراق میں یہ قتل کر دیا گیا

[2] کامل التاریخ (جسے تاریخ کامل بھی کہتے ہیں) کا مصنف شیخ ابوالحسن علی ابن ابی الکرم محمد ابن محمد ابن عبدالکریم ابن عبدالواحد الشیبانی تھا۔ اس کی عرفیت عزالدین بھی اور عام طور سے ابن اثیر کے نام سے معروف ہے۔ ۵۵۵ھ میں بمقام جزیرۂ ابن عمر پیدا ہوا تھا اسلئے اس کے نام کے ساتھ الجزری بھی لکھا جاتا ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۳۳ پر ملاحظہ فرمایئے)

مکروفریب کو روا نہیں رکھتا۔ مؤلف "جامع الحکایات" بیان کرتا ہے کہ:۔

"نہروالہ میں شکست کھانے کے بعد جب شہاب الدین محمد غوری واپس آیا تو بعض نے تحریری مشورہ دیا کہ نہروالہ کے ایک سردار واسابھر نے بہت سا اسباب تجارت جس کی قیمت تقریباً دس لاکھ روپے ہوگی غزنیں روانہ کیا ہے اس لئے اُس کو ضبط کر لینا چاہئے اور اسی رقم سے ایک فوج تیار کرکے نہروالہ پر حملہ کرنا چاہئے" شہاب الدین محمد غوری نے اس تحریر کی پشت پر جواب لکھا کہ:۔

"یہ انصاف کے خلاف ہے میں ایسا نہیں کر سکتا" (جامع الحکایات قسم ۱۔ باب ۶۔ حکایت ۳۷)

یورپ جسے اپنی تہذیب و شایستگی پر اسقدر ناز ہے اور جو مشرقی فرمانرواؤں کو جور و ظلم کا مجسمہ قرار دینے میں ذرا باک نہیں کرتا، کیا وہ اپنے عہد تہذیب و شایستگی کی کوئی ایسی مثال پیش کر سکتا ہے، جس میں اس قدر رواداری سے کام لیا گیا ہو۔ جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں جو مظالم عورتوں اور بچوں پر کئے گئے اُن کا مقابلہ کرنا چاہئے شہاب الدین غوری کی جنگ بنارس سے، جس میں ایک عورت اور ایک بچہ ہلاک نہیں کیا گیا۔ اور حال کے عظیم الشان اُصول حرب کو سردار نہروالہ کے واقعہ سے مطابق کرکے دیکھنا چاہئے کہ مخالف ملک کی تجارت کو تباہ و برباد کر دینا، وہاں کے مال و اسباب پر قبضہ کر لینا اولین اُصول قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ شہاب الدین غوری اب سے آٹھ صدی قبل کے عہد تاریک میں بھی اس کو روا نہ رکھتا تھا

چونکہ اس کو اپنی زندگی بھر صرف حرب و قتال سے واسطہ رہا اس لئے وہ اُن فنون کی طرف متوجہ نہ ہو سکا جو حالت امن و سکون میں نشو و نما پاتے ہیں۔ علاوہ اس کے یوں بھی خاندان غور کو نصف صدی سے کم ہندوستان سے واسطہ رہا اور یہ زمانہ جو بہت قلیل بھی تھا اور شورش و ہنگامہ کی وجہ سے ملک کے لئے ناقابل اصلاح بھی، اسی حال میں گزر گیا۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۳۲)

ابن خلکان جو ابن اثیر کا دوست تھا، بیان کرتا ہے کہ اس نے پہلے موصل میں تعلیم پائی اور پھر بغداد، شام اور بیت المقدس میں۔ بعد فراغ اس نے موصل میں درس جاری کیا اور اس کا مکان علمائے عصر کا مرکز بن گیا۔ ابن خلکان اس سے بمقام حلب سنہ ۶۲۶ھ میں ملا تھا اور اس کی نسبت یہ رائے قایم کی تھی کہ:۔ "ابن اثیر بڑا فاضل نہایت برگزیدہ صفات کا شخص ہے لیکن اسی کے ساتھ حد درجہ شرمیلا" دوسری جگہ ابن خلکان اُسے "شیخنا ابن اثیر" کہتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ:۔

"وہ علم حدیث کا بڑا متبحر عالم تھا اور جدید و قدیم تاریخ پر اُسے کامل عبور حاصل تھا۔ اسکی تاریخ کامل جو ابتدائے عالم سے سنہ ۶۲۸ھ تک محیط ہے اسکی بے مثل تصنیف ہے" اس میں شک نہیں کہ تاریخ کامل عجیب و غریب تاریخ ہے اور ایشیا و یوروپ میں ہر جگہ اس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ابن خلدون مشہور مورخ نے بہت کچھ اس سے اقتباس کیا ہے اور یوروپ کے موجودہ مورخین نے اسکی مدد سے متعدد تاریخیں لکھی ہیں۔ اس نے دوسری اور تیسری صدی ہجری کے جاٹوں کا کچھ حال بیان کیا ہے اور عربوں کی فتوحات سندھ کا بھی ذکر اسمیں موجود ہے لیکن ہندوستان کے متعلق اس کا وہ حصہ بہت زیادہ قابل غور ہے جس میں غزنوی اور غوری سلاطین کا حال درج ہے۔ حبیب السیر کا مصنف بیان کرتا ہے کہ تاریخ کامل کا ترجمہ تیمور کے بیٹے میران شاہ کے حکم سے نجم الدین زراری نے (جو میران شاہ کا کاتب خصوصی تھا) فارسی میں کیا تھا۔ ابن اثیر کی دوسری کتاب اخبار الصحابہ بھی بہت مشہور کتاب ہے۔ اسکے دو بھائی اور تھے جو اسکی طرح علمی مشاغل میں مصروف رہتے تھے ان میں سے ایک مجدالدین تھا جس نے اُصول حدیث کے فن میں ایک کتاب "جامع الاصول من حدیث الرسول" لکھی ہے جو اس کتاب کا مصنف غلطی سے ابن اثیر کو ظاہر کیا جاتا ہے۔

باب ہشتم

خاندانِ غلام

قطب الدین ایبک

۶۰۲-۶۰۷ھ
سنہ ۱۲۰۶-۱۲۱۰ع

فرشتہ نے سلطان قطب الدین ایبک کے حالات میں لکھا ہے کہ :-

"بہ اخلاق حمیدہ واوصاف پسندیدہ موصوف بود وروش شہریاری و قواعد جہانداری نیکو میدانست"[۱]

قطب الدین ایبک جس خاندان کا اولین فرمانروا ہے اُسے "خاندانِ غلام" اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ شہاب الدین محمد غوری کا غلام تھا۔ چونکہ شہاب الدین محمد غوری کے کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی اس لئے وہ غلاموں کی پرورش و تربیت کا بہت شایق تھا۔ اگر کوئی شخص شہاب الدین محمد غوری سے لاولد ہونے پر تاسف کرتا تو وہ جواب دیتا کہ "کیا یہ ہزاروں ترکی غلام میری اولاد نہیں ہیں[۲] ؟

ان غلاموں میں سے چار نے بہت شہرت حاصل کی۔ قطب الدین ایبک نے دہلی میں، تاج الدین یلدوز نے غزنی میں، ناصر الدین قباچہ نے سندھ میں اور محمد بختیار خلجی نے بنگال میں

قطب الدین ایبک کو صغر سنی کی حالت میں ایک تاجر ترکستان سے نیشاپور لایا، اور ابن عبد العزیز قاضی فخر الدین کوفی کے ہاتھ فروخت کیا۔ قاضی صاحب اولادِ ابو حنیفہ میں سے تھے اور فضلاءِ عصر میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ چونکہ اس عہد میں غلاموں کو بھی

۱؎ فرشتہ جلد اول صفحہ ۶۰ (نولکشور) — ۲؎ فرشتہ جلد ۱ - صفحہ ۶۲ (نولکشور)

مثل اولاد کے سمجھا جاتا تھا اس لئے قاضی فخر الدین نے اپنے لڑکوں کے ساتھ قطب الدین کو بھی مکتب میں بٹھا دیا۔ چونکہ فطرتاً بہت ذہین اور جفاکش تھا، اس لئے تھوڑے ہی عرصہ میں علوم متداولہ سے آگاہ ہوگیا۔ جب قاضی فخر الدین کا انتقال ہوگیا تو ایک تاجر نے معقول قیمت دے کر قطب الدین کو مول لے لیا اور تحفۃً سلطان شہاب الدین غوری کی خدمت میں پیش کیا اور رفتہ رفتہ اس نے اپنے حسنِ خدمات سے شہاب الدین کو اپنا گرویدہ بنا لیا

لفظ ایبک کی تشریح

طبقاتِ ناصری کے حوالہ سے فرشتہ، طبقات اکبری اور تمام مورخین نے اس کے ایبک کہلائے جانے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ اس کے ہاتھ کی چھوٹی انگلی ٹوٹی ہوئی تھی لیکن ہم اس کو صحیح نہیں سمجھ سکتے کیونکہ "ایبک" کا لفظ صرف قطب الدین ہی کے ساتھ استعمال نہیں ہوا بلکہ بہت سے لوگ "ایبک" کہلاتے تھے۔ "ایبک" حقیقۃً ترکوں کا ایک خاندان ہے جیسا کہ غالب لکھتا ہے "ایبکم از جماعۂ اتراک" اور اس کے معنی ہیں "چاند کا سردار"۔ چونکہ ترکوں میں یہ خاندان نہایت حسین خاندان تھا اس لئے اُسے "ایبک" کہنے لگے۔ "ایبک" کا ترجمہ طبقات ناصری نے لفظ شل سے کیا ہے، حالانکہ یہ صحیح نہیں

لفظ "ایبک" مرکب ہے "اے" اور "بک" سے۔ "بک" کے معنی ہیں "سردار" اور "اے" ترکی میں کہتے ہیں چاند کو۔ اس امر کا ثبوت کہ یہ اے اور بک سے مرکب ہے علاوہ اس کی ظاہری ترکیب کے قطب مینار دہلی سے بھی ملتا ہے جس پر لفظ ایبک ملا ہوا نہیں بلکہ اے اور بک الگ الگ منقوش ہے

قطب الدین کی خصوصیات

بہر حال قطب الدین ترکی النسل تھا اور علاوہ جمالِ ظاہری کے حسنِ سیرت بھی بدرجۂ اتم رکھتا تھا۔ صاحب طبقات ناصری نے لکھا ہے کہ قطب الدین نہایت جری بادشاہ تھا اور سخاوت میں تو اُسے حاتم ثانی کہنا چاہیئے۔ اس میں وہ صفات حکمرانی پائی جاتی تھیں جو اُسوقت مشرق و مغرب کے کسی بادشاہ میں نظر نہیں آتی تھیں۔ اُس کی اِس فیاضانہ فطرت نے سارے ہندوستان کو اُس کا مطیع بنا دیا، یہاں تک کہ ایک شخص بھی اُس کا دشمن نہ تھا۔[1]

شہاب الدین محمد غوری نے اس کی بلند نظری اور عالی حوصلگی کا اندازہ اول اول کیونکر کیا، اس کے متعلق مورخین نے بیان کیا ہے کہ "ایک شب شہاب الدین محمد غوری نے محفل طرب قایم کی اور فرطِ مسرت کے عالم میں تمام حاضرین کو بیش بہا انعامات دئے۔ ان انعام پانے والوں میں قطب الدین بھی تھا۔ جب محفل ختم ہوئی تو قطب الدین نے جو کچھ زر و جواہر، درہم و دینار پایا جاتا تھا سب کا سب ادنیٰ خادموں کو تقسیم کر دیا اور ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہ رکھا۔ صبح کو جب یہ خبر سلطان کو معلوم ہوئی تو اُسنے قطب الدین کی اس ادا کو بہت پسند کیا اور اُسی وقت طبقۂ امراء میں اُسے شامل کر لیا[2]۔ اس کے بعد اُس نے بہت جلد جلد ترقی حاصل کی یہانتک کہ میراخوری[3] کے عہدہ پر مامور ہوگیا[4]۔ اور پھر رفتہ رفتہ ہندوستان کا والسرائے ہوکر خود سلاطین غور

[1] طبقات ناصری جلد ۱۔ صفحہ ۲۹۸ — [2] طبقات اکبری صفحہ ۲ — [3] میر آخور یعنی شاہی اصطبل کا مہتمم۔ اُس کا فرض یہ بھی تھا کہ جب فوج باہر کوچ کرتی تو گھوڑوں کی نگہداشت کرتا اور دیکھتا کہ اُن کے دانہ پانی کا انتظام درست ہے یا نہیں۔ — [4] فرشتہ جلد ۱۔ صفحہ ۶۱۔

نے اُسے سلطانِ ہند تسلیم کر لیا

اس میں شک نہیں کہ اس کا زمانہ سلطان شہاب الدین محمد غوری کی معیت میں، اور نیز خود مختار بادشاہ ہونے کے بعد بھی زیادہ تر حرب و جنگ میں بسر ہوا لیکن اسی کے ساتھ اُس نے اپنے ذوق علم کا بھی کافی ثبوت دیا اور سیکڑوں مساجد تعمیر کرائیں جو نہ صرف درس مذہبی بلکہ تعلیم علوم و فنون کا بھی مرکز تسلیم کی جاتی تھیں

جب غیاث الدین محمود، غیاث الدین محمد غوری کے بیٹے نے قطب الدین کے لئے چترِ بادشاہی اور خطاب سلطانی ہندوستان روانہ کیا اور قطب الدین تختِ دہلی پر بیٹھا تو اُس نے اسقدر داد و دہش کی کہ لک بخش کے نام سے مشہور ہو گیا اور بہاء الدین جو اُس کے عہد کا مشہور فاضل تھا ان الفاظ میں تعریف کرنے پر مجبور ہو گیا کہ:-

[1] اے بخشش لک تو جہان آوردہ — کان رائکفِ تو کار بجان آوردہ
از رشک کفِ تو خون گرفتہ دلِ کان — وز لعل بہانہ درمیان آوردہ

صاحب تاج المآثر[2] نے لکھا ہے کہ:-

"قطب الدین ایبک ایسا عادل بادشاہ تھا کہ اس کے عہد میں (بطور ضرب المثل) گرگ و گوسفند ایک ہی جگہ پانی پیتے تھے" سڑکیں محفوظ تھیں۔ رہزنی مفقود ہو گئی تھی اور تمام رعایا خوشحال اور مطمئن زندگی بسر کرتی تھی۔ تعصب بالکل نہ تھا ہندو بھی مسلمانوں کے برابر سلطان قطب الدین کی فیاضی سے حصہ پاتے تھے اور انصاف میں مذہب و دولت، جاہ و امارت کا کوئی لحاظ نہ کیا جاتا تھا۔ اس نے دہلی میں ایک نہایت عمدہ مسجد جامع تیار کرانی شروع کی، جس کی یادگار قطب مینار کی صورت میں اب بھی پائی جاتی ہے

---

[1] تو ہی وہ شخص ہے جس نے لاکھوں کی بخشش کو دنیا میں ظاہر کیا اور زر و جواہر کی معدنیں تیری فیاضی کو دیکھ دیکھ کر حسد سے جلنے لگیں۔ لعل تو صرف بہانہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تیرے دستِ کرم کے کرشمے دیکھ کر معدن کا دل خون ہو گیا ہے۔

[2] تاج المآثر میں زیادہ تر صرف قطب الدین ایبک کے حالات درج ہیں۔ معلوم نہیں اس کو تاج المآثر کیوں کہتے ہیں حالانکہ مصنف نے کہیں اس کا نام ظاہر نہیں کیا۔ مشرق میں یہ کتاب ہمیشہ سے خاص شہرت رکھتی تھی۔ لیکن یورپ کو اس کا علم صرف ہیمر (Hammer) کے طفیل سے حاصل ہوا ہیمر لکھتا ہے کہ:-

"اگر حسن نظامی (مولف تاج المآثر) قطب الدین کے حالات نہ لکھتا تو آج یہ بھی اُن دوسرے فرمانرواؤں کی طرح گمنام حالت میں رہتا جن کے حالات کہیں تاریخ سے معلوم نہیں ہوتے"

حسن نظامی کے حالات زندگی بہت کم معلوم ہیں اس نے تاج المآثر کے دیباچہ میں اپنا نام حسن نظامی تحریر کیا ہے میر خوند نے اس کا نام صدر الدین محمد بن حسن نظامی ظاہر کیا ہے اور ابو الفضل نے بھی آئین اکبری میں یہی نام درج کیا ہے۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۳۷ پر ملاحظہ ہو)

قطب الدین ایبک کے عہد میں تاج الدین یلدوز، ناصر الدین قباچہ اور بختیار خلجی نے جنھیں قطب الدین کی طرح شہاب الدین محمد غوری کے غلام ہونے کا فخر حاصل تھا، کارہائے نمایاں کئے اور ان میں سے ہر ایک اپنے عزم مردانہ اور جرأت دلیرانہ کے نقوش چھوڑ گیا

تاج الدین یلدوز کی نسبت صاحب طبقات اکبری لکھتا ہے کہ:-

"بادشاہ بزرگ وکریم وصاحب اخلاق حمیدہ بود وجمالِ وافر داشت۔"

سلطان شہاب الدین محمد غوری نے اس کو بھی صغر سنی سے پرورش کیا اور رفتہ رفتہ درجات امارت پر پہونچا دیا۔ تاج الدین کی دو لڑکیاں تھیں ایک قطب الدین ایبک کو منسوب ہوئی اور دوسری ناصر الدین قباچہ کو۔ محمد غوری کے بعد تاج الدین ہی تخت غزنین پر متمکن ہوا

یلدوز کا ایک نہایت محبوب بچہ معلم کے سپرد تھا ایک دن اُس معلم نے لڑکے کے سر پر کوڑا مارا اور اتفاق سے وہ مر گیا

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۳۶)

ہیمر نے اسے باشندۂ لاہور بتایا ہے لیکن یہ بالکل غلط ہے وہ نیشاپور کا رہنے والا تھا اور اس نے اسوقت تک اپنا وطن نہیں چھوڑا جب تک خراسان کے حالات نے اُسے اس پر مجبور نہیں کر دیا۔ یہ پہلے غزنی آیا اور کچھ دن قیام کرنے کے بعد دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ راہ کی صعوبتوں کا حال اسنے نہایت موثر انداز میں لکھا ہے۔ دہلی پہونچ کر وہ شرف الملک قاضی شہر سے ملا اور چند دن بعد احباب کے اصرار سے اسنے یہ تاریخ مرتب کرنی شروع کی۔

۶۰۲ھ/۱۲۰۵ء میں اس تاریخ کی ترتیب شروع ہوئی اور اسی سال شعبان کے مہینہ میں شہاب الدین محمد غوری کی وفات وقوع میں آئی اس سے ظاہر ہے کہ جسوقت تاج المآثر کی تحریر شروع ہوئی محمد غوری زندہ تھا اور اس لئے حسن نظامی نے اس کے نام سے اپنی تاریخ کو منسوب کیا

ہیمر پرگستال (Hammer Purgstall) کی یہ تحقیق کہ قطب الدین ایبک کی وفات کے بارہ سال بعد تاج المآثر مرتب ہوئی غلط ہے۔ اس نے اس کتاب کو محمد بن سام بن حسین سے منسوب کیا ہے لیکن مسٹر ہیمر نے اس محمد بن سام کو فرمانروائے لاہور خیال کیا حالانکہ مصنف کا مقصود اس سے شہاب الدین محمد غوری ہے۔ یہ تاریخ ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء سے شروع ہوتی ہے جب محمد غوری اپنی شکست کا انتقام لینے کے لئے حملۂ ہندوستان کی تیاریاں کر رہا تھا۔ عام طور سے جو نسخے تاج المآثر کے نظر آتے ہیں اُن میں ۶۱۴ھ/۱۲۱۷ء (یعنی قطب الدین ایبک کے سات سال بعد تک) کا حال درج ہے لیکن بعض قلمی نسخوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ۶۲۶ھ/۱۲۲۸ء (یعنی شمس الدین التمش کے زمانہ) کے حالات بھی درج کئے ہیں

اس کتاب میں عربی اور فارسی عبارتیں دونوں کثرت سے ملی ہوئی نظر آتی ہیں اور تشبیہات، استعارات و دیگر صنایع و بدایع سے بہت زیادہ کام لیکر مورخانہ حیثیت کو ضعیف کر دیا ہے

سلطنت قطب الدین ایبک کے متعلق جو تاریخی حالات اس میں درج ہیں وہ نہایت قلیل اور غیر اہم ہیں

ہیمر نے شمار کر کے ظاہر کیا ہے کہ اس میں بارہ ہزار سطریں ہیں جن میں سات ہزار سطریں عربی اور فارسی کے اشعار پر مشتمل ہیں

جب یہ خبر یلدوز کو پہونچی تو اُس نے معلم کو بلاکر کچھ نہیں کہا اور سفر خرچ دیکر تاکید کی کہ "قبل اس کے کہ لڑکے کی ماں کو خبر ہو تم یہاں سے علحدہ ہو جاؤ اور کہیں اور چلے جاؤ"[۱] اس سے یلدوز کی حسن سیرت اور بلندیِ فطرت کا اندازہ اچھی طرح ہو سکتا ہے۔

ناصر الدین قباچہ

ناصر الدین قباچہ علاوہ اپنی شجاعت و جرأت کے کیاست و تمیز میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ صوبۂ سندھ اس کے سپرد تھا، جہاں اُس نے ۲۲ سال تک حکومت کی

اس زمانہ میں بہت سے معرکے پیش آئے اور ہر ایک کو اُس نے اپنے بذل و کرم اور احسان و انعام سے اپنے لئے آسان بنالیا۔ جب چنگیز خاں کے فتنہ نے خراسان و غزنین کے اکابر کو سراسیمہ کر دیا تو یہ سب کے سب قباچہ کے پاس پناہ گزیں ہوئے اور اس نے نہایت دریا دلی سے اپنے خزانہ کا مُنھ ان لوگوں کے لئے کھول دیا[۲]

محمد بختیار خلجی

بختیار خلجی، بلاد غور اور گرم سیر کے اکابر میں سے تھا۔ شہاب الدین محمد غوری کے عہد میں یہ غزنین پہونچا اور وہاں سے ہندوستان آیا۔ یہ شخص اپنی اصابت رائے اور سخاوت و شجاعت میں بہت مشہور تھا اس نے لکھنوتی میں ایک شہر کی بنیاد ڈالی اور اس کو دار السلطنۃ بنایا۔ اُس نے مسجدیں، خانقاہیں اور مدارس کثرت سے تعمیر کرائے[۳]۔ قطب الدین ایبک اس کے مردانہ عزائم کی بہت قدر کرتا تھا۔ الغرض شہاب الدین محمد غوری کے تمام غلام حقیقی معنے میں اہل ثابت ہوئے اور اگر انسانی صفات پر ابتدائی تربیت کا اثر پڑ سکتا ہے تو ہمیں اس باب میں حضرت شہاب الدین محمد غوری کی تعریف کرنی چاہئے جس نے اپنے غلاموں کو بالکل اولاد کی طرح رکھا اور اُن کی تعلیم و تربیت کا وہی اہتمام کیا جو ایک حکمراں کی اولاد کے لئے کیا جاتا ہو پھر خصوصیت کے ساتھ یہ واقعہ کہ ہندوستان میں سب سے پہلے سلطنت کی طرح قطب الدین ایبک نے ڈالی اس کا امتیاز حقیقۃً محمد غوری ہی کو حاصل ہے کیونکہ ایبک اسی کا غلام تھا اور اسی کی نگرانی میں وہ ہندوستان کے اندر قصرِ حکومت تعمیر کرنے کی قابلیت حاصل کر سکا۔

قطب الدین ایبک کی فتوحات

قطب الدین ایبک کے خاص خاص کارنامے وہی تھے جو شہاب الدین کے عہد میں بہ حیثیت وائسرائے دہلی اُس سے ظاہر ہوئے اور جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں

جب شہاب الدین غوری کے بعد ایبک دہلی کا بادشاہ ہوا تو اُسنے خود اپنی کوشش اور نیز محمد بختیار کی مساعی سے جو بنگال کی طرف سے سلطنت کو وسیع کر رہا تھا قریب قریب تمام ہندوستان کو (کوہستان بندھیاچل کے شمال میں) اپنی قلمرو کے اندر داخل کر لیا، لیکن افسوس ہے کہ جس سلطنت کی قطب الدین ایبک نے قائم کیا اُسکی پوری ترقی وہ نہ دیکھ سکا اور اپنے آقا محمد غوری کی وفات کے بعد صرف چند سال زندہ رہ سکا اور سنہ ۶۰۷ھ (۱۲۱۰ء) میں چوگان کھیلنے میں گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ فتح دہلی سے اگر شمار کیا جائے تو اسکی مدتِ حکومت بیس (۲۰) سال اور اگر شہاب الدین کی وفات سے اُسکی سلطنت کی ابتدا مانی جائے تو چار سال قرار پائے گی[۴]

---

[۱] طبقات اکبری صفحہ ۲۱ - [۲] طبقات اکبری صفحہ ۲۲ - [۳] طبقات اکبری صفحہ ۲۲ - [۴] طبقات ناصری صفحہ ۱۴۱

چوتھا باب

امر ربانی

سیارۂ محبت میں تنہا میں ہی زندگی بسر نہیں کر رہا تھا بلکہ میرے ساتھی اور بہت تھے جو شب و روز معلم اکبر کی صحبت و گفتگو سے مستفید ہو رہے تھے

ایک بار وہ مجھے "جبل تجلی" پر لے گیا اور اپنی روحانی حکومت کی وسعت و آزادی کے مطالعہ کرنے کا موقعہ مجھے دیا۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ یہ شاید عالم ایجاد کی انتہا ہے اور حدود لانہایت اس جگہ ختم ہو جاتے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا یہ ستارۂ محبت، کائنات کا بالکل آخری ستارہ ہے اور کیا اس کے بعد جو کچھ ہے وہ ماورائے آفرینش ہے"

اس نے ایک محبت آمیز تبسم کے ساتھ سمت الراس کی طرف دیکھنے کا اشارہ کیا اور جب میں نے اس طرف نگاہ اُٹھائی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ایک اور ستاروں بھری کائنات معہ کروروں آفتابوں کے مجھ سے قریب ہوتی جا رہی تھی اور چاروں طرف سوائے روشنی اور منور کروں کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں سرعت برق کے ساتھ ہر طرف دوڑتا پھر رہا ہوں اور پھر بھی اپنے مرکز سے دور نہیں ہوتا۔ میں مایوس ہو کر بے اختیارانہ چیخ اُٹھا "کیا میں کبھی انتہا تک نہ پہونچ سکوں گا"

معلم اکبر کی روح نے جواب دیا "نہیں تم انتہا تک پہونچ گئے ہو، کیونکہ جس نے مجھے دیکھ لیا اس نے گویا خدا کی خدائی کو دیکھ لیا، اور جہاں میں اپنی حکومت قائم کر دوں وہیں کائنات کا آغاز ہوتا ہے اور وہیں اس کا انجام"

میں نے آسمان کی نیلگوں سقف کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "کیا آپ ہی کائنات کے روحانی فرمانروا ہیں"

اس نے کہا "ہاں" اور میں اس کے حضور میں دوزانو ہو گیا

اور کروں سے جو روحانی طلبہ آئے تھے ان کی تعلیم کے لئے معلم اکبر نے علٰحدہ علٰحدہ وقت مقرر کئے تھے۔ وہ فردوس میں ہر ایک کو تنہا لیجاتا اور وہاں اس کو مخصوص تعلیم دیتا کیونکہ ہر کرہ کی نوعیت و ضرورت کے لحاظ سے تعلیم بھی مختلف تھی جس سے دوسروں کو آگاہ کرنے کی ضرورت نہ تھی

ہمارے پہونچنے کے چند دن بعد ہم کو حکم ملا کہ ایک پہاڑ کے دامن میں جمع ہوں۔ یہ ایسا تجربہ تھا جسکو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ہم لوگ سب مرغزار پر جمع تھے کہ دفعتاً ایک روشنی کا ستون نمودار ہوا اور بڑھتے بڑھتے وہ ہمالیہ کی

چوٹیوں سے بھی اوپر گزر گیا۔ اسوقت صاف آسمان میں اس کا وجود ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نیلگوں پردہ کے سامنے کوئی عظیم الشان مجسمہ بلور قایم ہے۔ اس کے لبوں پر جنبش پیدا ہوئی اور اس کے یہ مقدس الفاظ ہمارے کانوں تک پہونچے :۔ اے ابدیت کے طالب علمو اور نظامہائے شمسی کے آیندہ پیغمبرو، اب کمر ہمت باندھ کر آمادہ ہو جاؤ، اپنی روحوں کو کائناتی صداقت سے معمور کرلو، اپنے گوش وچشم کو اچھی طرح کھول لو اور اپنے سینوں کو وسیع کرلو تاکہ آفتاب صداقت کی روشنی ان میں بیش از بیش ودیعت کیجا سکے

یاد رکھو کہ تم میری ملکیت ہو اور میری ملکیت کبھی ضایع نہیں ہو سکتی۔ خوف وہراس اپنے دلوں سے نکالدو، تم لوگ میری روشنی ہو اور میری روشنی کبھی گُل نہیں ہو سکتی۔ میں تمھارے دلوں کو علم وعرفان کا کبھی نہ ختم ہونے والا خزینہ بنا دوں گا تاکہ تم ساری دنیا کو یہ دولت نہایت آزادی سے تقسیم کرتے رہو۔ آج کے دن میں نے تم پر لامکانی کے دروازے کھولدئے ہیں اور تم میری بہشت میں پھولوں کی سی زندگی بسر کروگے۔ روشنی حاصل کرنے کے لئے بیتاب اور خوشبو دینے کے لئے مجبور!"

اس کے بعد ہم نے معلم اکبر کی نگرانی میں اپنی فردوسی زندگی شروع کردی اور ایک زمانہ جب اسی طرح بسر ہو گیا، تو ایک دن اس نے ہم میں سے چند طلبہ کا انتخاب کرکے اپنے حضور میں طلب کیا اور کہا کہ "آج میں تم کو وہ بات بتانا چاہتا ہوں جس کی تکمیل کے لئے تمام عالم آفرینش وجود میں آیا ہے۔ کائنات میں اصل چیزیں دو ہیں زندگی اور حرکت۔ لیکن ان دونوں کا امتزاج بغیر محبت کے مشکل ہے، اس لئے یاد رکھو کہ آفرینش کا مقصود اصل صرف محبت کرنا ہے

محبت، فطرت کا وہ زبردست قانون ہے جو کبھی نہیں بدل سکتا۔ محبت زندگی کی وہ روح ہے جو کائنات میں ہر ہر چیز کو اپنی اپنی جگہ قایم رکھے ہوئے ہے۔ محبت ایک مقناطیسی قوت ہے جو تمام کروں میں اپنا کام کر رہی ہے اور کائنات کا توازن اسی پر منحصر ہے۔ اس لئے جب تم اپنے اپنے کروں میں جاؤ تو اسی جذبہ کو اپنے ساتھ لیجاؤ اور اپنے ابنائے جنس کو محبت ہی کا درس دو۔ نفرت کا جواب اُلفت سے دو، شک وشبہ کی جگہ اعتماد ویقین سے پُر کرو اور غصہ کا مقابلہ نرمی والتفات سے کرو۔ ساری کائنات ایک ہی وطن اور اس کے رہنے والے ایک ہی وطن وخاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے تم انھیں بتاؤ کہ گزرے ہوئے رہنماؤں اور پیامبروں ہی کے کہنے پر اعتماد کرکے بیٹھ جانا غلطی ہے۔ ضرورت ہے کہ مستقبل کے آئینہ کو دیکھا جائے جو خود قلوب انسانی میں پوشیدہ ہے اور تمام بنی نوع انسان کو کائناتی اخوت ومحبت کے رشتہ سے وابستہ کیا جائے

اپنے بھائیوں کو سمجھاؤ کہ قدیم مقابر کی خاک چھاننا بیکار ہے، جو گزر گیا سو گزر گیا، قبر کے اندر دفن ہونے والے اب کوئی فایدہ نہیں پہونچا سکتے، ان کے بتائے ہوئے اصول انھیں کے زمانہ کے لئے مفید رہے ہوں تو رہے ہوں

لیکن اب وہ لایعنی ہے ۔ اس وقت تو صرف اس روشنی سے کسب ہدایت کی ضرورت ہے جو انسانی روحوں کی قربانگاہوں میں جگمگا رہی ہے

تم انھیں سمجھاؤ کہ اب اجتماعِ قومی نہیں بلکہ اجتماعِ روحانی کی ضرورت ہے، ایک ایسی قوم کی ضرورت ہے جو قومیت کی تفریق نہ رکھتی ہو، ایک ایسی جماعت درکار ہے جس کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ صرف رشتۂ محبت سے وابستہ ہوں

تم یہ حقیقت بھی ان کے ذہن نشین کرو کہ اینٹ پتھر کے معبد بنانے کا زمانہ گزر گیا، اب ایک ایسے معبد کی ضرورت ہے جس کا گنبد فلک لافلاک ہو اور جس کی چار دیوار افقِ لانہایت ۔ یہ وہ معبد ہوگا جس کے دروازے ہر انسان کے لئے ہر وقت کھلے رہیں گے اور جس کی آرائش صداقت و آزادی سے کی جائے گی ۔ اور جس کی محراب میں صرف قندیلِ محبت کی روشنی ہوگی ۔ فطرت کی وسعت اس مندر کی قربانگاہ ہوگی اور اس کے اندر پرستش کرنے والے خواہ وہ برے ہوں یا اچھے ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے

تو، اپنے بھائیوں سے جا کر کہنا کہ اب وہ ایک ایسا ہی معبد طیار کریں اور اسی معبد میں تم انسانیتِ جدیدہ کے فرزندوں کو خود اپنا مالک بننا سکھاؤ، اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا بتاؤ، آزادی کا وہ درس دو جو ملک و ملت، رنگ و نسل اور مذہب و مسلک کے امتیاز سے بلند ہے

تم انھیں یہ بتاؤ کہ قدیم خیالات، فرسودہ و کہنہ معتقدات روح کے لئے زنجیریں ہیں جن کے توڑے بغیر منزل تک پہونچنے کی کوئی صورت نہیں ــ ترقی کرتے رہنا انسان کا فطری فرض ہے کیونکہ حقیقی مسرت اور تکمیل آفرینش بغیر اس کے حاصل نہیں ہو سکتی ۔"

معلم اکبر کی اس تقریر کے بعد ہر چہار طرف ایک گہری خاموشی طاری ہو گئی اور میں نے اپنی جگہ ایک خاموش عہد دل ہی دل میں کر لیا کہ ان ہدایات کی تعمیل لفظ بہ لفظ کروں گا ۔

پانچواں باب

جبلِ نور

طلبہ میں سے ایک لڑکی دلآرام بھی تھی، جو کرۂ زہرہ سے آئی تھی ۔ اس کے خیر مقدم میں معلم اکبر نے ایک خاص جلسہ طلب کیا جس میں تمام طلبہ کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی ۔

دلآرام اس قدر عجیب و غریب چیز تھی کہ اگر اس کو قدرت کا شاہکار یا معجزۂ الہانہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ میں متعدد بار اس کو دیکھ چکا تھا، اس سے ہمکلام ہو چکا تھا اس لئے مجھے معلوم تھا کہ وہ کسقدر غیر معمولی ذہین تھی۔ وہ مجھ سے کرۂ زمین کی بابت اور میں کرۂ زہرہ کی بابت اکثر سوال کرتا رہتا اور میرے بعض بیانات پر وہ بے اختیارانہ دیر تک ہنستی رہتی

خیر مقدم کی تقریب میں بھی وہ ہر نگاہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ میرا باصرہ اس کی ہر ہر حرکت اور میرا سامعہ اسکے ایک ایک لفظ کا تعاقب کر رہا تھا اور میں ایسا محسوس کرتا تھا کہ موسیقی محض کا تعاقب کر رہا ہوں۔ وہ حد درجہ نازک تھی لیکن اس کی نزاکت ہی اس کی بڑی طاقت تھی اور جس وقت وہ کسی طرف سے گزر جاتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر چہار طرف پھول بکھیر گئی۔ وہ نہ ماضی کی مخلوق معلوم ہوتی تھی نہ حال کی، بلکہ وہ کوئی مستقبل کی مخلوق تھی جسے انسانیت جدیدہ کی آرزو کہنا زیادہ مناسب ہوگا

ہم سب معلم اکبر کی آمد کا انتظار کر رہے تھے اور ابھی تک رسم خیر مقدم شروع نہ ہوئی تھی، اتفاق سے میری نظر جام زر کوکب الدجاجہ کے طالب علم پر پڑی اور میں نے اس سے گفتگو شروع کر دی، گفتگو کا موضوع "جنگ" تھا اس نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ کن تدبیروں سے اس کی دنیا میں جنگ کے خیال کو دور کیا گیا ہے۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ دفعتاً نسیم معلم اکبر کا مخبر و پیامبر جو کائنات کے مختلف کروں کے حالات دریافت کرنے کے لئے مامور کیا گیا تھا، فضا میں نمودار ہوا اور مکدر و غمگین چہرہ لئے ہوئے معلم اکبر کی خلوت گاہ میں داخل ہو گیا

ایک لمحہ کے بعد پردہائے نورانی کے اندر سے معلم اکبر نمودار ہوا اور اس کے چہرہ سے بھی آثار حزن و ملال نمایاں تھے۔ پہلے وہ سیدھا دلآرام کی طرف گیا اور اس کا محبت آمیز خیر مقدم کرنے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، گویا وہ کسی کی جستجو میں تھا۔ آخر کار اس کی نگاہ صرصر پر جا کر ٹھہری جو کرۂ مریخ کا طالب علم تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ معلم اکبر اس سے گفتگو کرنا چاہتا ہے اس لئے وہ فوراً سامنے حاضر ہو گیا

معلم اکبر نے اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ "اے صرصر، تمھارے کرۂ مریخ سے نہایت دردناک خبر موصول ہوئی ہے باطل جماعت نے حق جماعت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے اور اسوقت دونوں میں نہایت خونریز جنگ جاری ہے"

یہ کہتے ہوئے اسنے اپنے ہاتھ کو جنبش دی اور اوپر نگاہ کر کے کہا کہ "دیکھو وہاں کیا ہو رہا ہے"۔ سب کی نگاہیں خلا کی طرف اُٹھ گئیں اور سب نے دیکھا کہ دو فوجیں مصروفِ خونریزی ہیں۔ جماعتِ حق کی حالت بہت نازک ہو اور باوجود انتہائی استقلال و جرات کے پسپا ہوتی جا رہی ہے۔ صرصر یہ منظر دیکھ کر کانپ اٹھا اور معلم اکبر کے قدموں پر گر کر بولا کہ "اے آقا، جماعتِ حقہ کی مدد کر اور اگر اسوقت اس کا غالب آنا ممکن نہیں ہے تو کم از کم جو افراد باقی رہ گئے ہیں انھیں کو اپنی حفاظت میں لیلے ورنہ پھر میرے کرہ میں کوئی روشنی پھیلانے والا باقی نہ رہے گا"

نگار بک ایجنسی

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مجموعۂ استفسار و جواب ۳ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۲۲ء سے لیکر ۳۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی، مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فیجلد تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے فی جلد ایکروپیہ کم

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲ر)

خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:۔

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲۔ مادئین کا مذہب۔

۳۔ حرکت کے کرشمے۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰ر)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے دو آنہ (۲ر) کم

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کردینا آخر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲ر)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا کی تہذیب و شایستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (۲ر)

علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

کمال طاقت — کمال
نوجوانی — کمال
جوانمردی — کمال
حوصلہ — کمال
اُمنگ — کمال

KAMAL • کمال
REGD. رجسٹرڈ

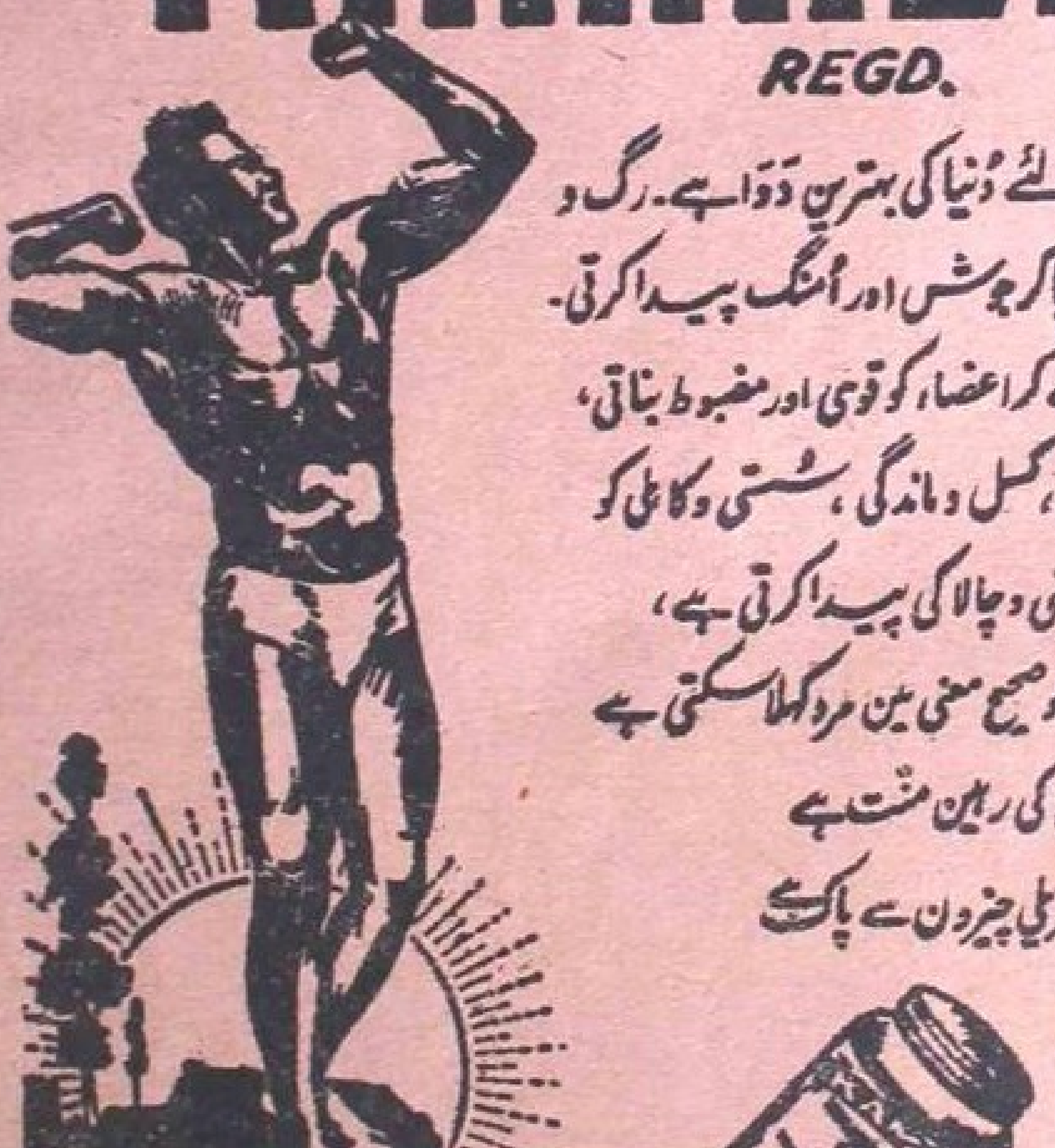

خون کی افزائش کے لئے دُنیا کی بہترین دوا ہے۔ رگ و ریشہ مین خون پہنچا کر جوش اور اُمنگ پیدا کرتی۔ اعصاب کو تقویت دے کر اعضا کو قوی اور مضبوط بناتی، دل و دماغ کو قوت دیتی، کسل و ماندگی، سُستی و کاہلی کو دفع کرکے چُستی و چالاکی پیدا کرتی ہے،
غرض کہ جو قوت ایک مرد کو صحیح معنی مین مرد کہلا سکتی ہے
وہ "کمال" ہی کی رہین منت ہے
نشے والی اور زہریلی چیزون سے پاک ہے

قیمت فی شیشی آٹھ روپے

مزید معلومات کیلئے فہرست طلب کیجئے!

TAYYEBI DAWAKHANA UNANI
INDORE BOMBAY 3

طیبی دواخانہ یونانی

چوک بازار، اندور
تار کا پتہ، شاہی اندور

۶۶، محمد علی روڈ بمبئی ۳
ٹیلیفون نمبر ۲۶۹۸۳

پرنٹر لیاقت حسین ہاشمی منیجر مختار پرنٹنگ ورکس، پبلشر شاہد حسین دفتر نگار لکھنؤ